راول ڈلیس — ہنساسی

عزیز ملک

راول دیس

عزیز ملک

راول دیس

بک سنٹر۔ حیدر روڈ — راولپنڈی

اشاعت اوّل ———— ایک ہزار

جنوری سن ۷۰ء

قیمت ———— پانچ روپے

اہتمام — غلام محمد قریشی بک سنٹر حیدر روڈ راولپنڈی

مطبع — فرنٹیئر ایکسچینج پریس راولپنڈی صدر

ترتیب

سیّد عطا حسین کلیمؔ

کے

نام

خونِ دل سے سینچے کشتِ ہنر لیکن ظفرؔ
حیف ہے اُس اشک پر جس کو گہر کرنا پڑے

(یوسف ظفرؔ)

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

تعارف

ممتاز مفتی

عزیز ملک سے میں ۱۹۵۵ء میں متعارف ہوا۔ صرف رسمی میل جول ہی نہیں۔ بہت قریب سے اُسے دیکھنے کا موقعہ ملا۔

زندگی میں مجھے بہت سے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو ادب لکھتے ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے اصحاب ملے جو ادب بولتے تھے۔ سب سے پہلے میرٹھ میں صفدر ملا۔ ان دنوں اُسے صفدر حسین کہتے تھے اب وہ ڈاکٹر صفدر حسین ہے۔ سب سے آخر میں راولپنڈی میں عزیز ملک ملا۔ جو جب بھی عزیز ملک تھا۔ اب بھی عزیز ملک ہے۔

عزیز ملک کی عام روزمرہ کی گفتگو ادبی رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ کسی واقعہ شخصیت منظر یا تاثر کو بیان کرتے ہوئے اَن جانے میں

عزیزہ ملک کا کلام ادبی رنگ اختیار کر جاتا ہے۔

عام طور سے عزیزہ ملک کو جاننے والے اس کے ادبی کلام سے واقف نہیں ہوتے۔ چونکہ عزیزہ ملک گونگا ہے وہ آپ کے روبرو روزمرہ قسم کی گفتگو کرنے سے بھی گریز کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیزہ ملک ازلی طور پر اکیلا ہے۔ اکیلا اور تنہا ــــ

عزیزہ ملک وہ پھول ہے جو اکیلے میں کھلتا ہے اور ناظر کی نگاہ پڑ جائے تو مُرجھا جاتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ عزیزہ ملک کا ادبی کلام سنیں تو آپ کو اس قدر قریب جانا ہوگا کہ عزیزہ ملک کو آپ پر اپنے آپ کا گمان ہونے لگے۔ کم از کم آپ کی موجودگی احساسِ غیریت نہ دلائے ــــ بلکہ اس کے احساسِ تنہائی کو تقویت دے۔ پھر دیکھئے یہ بظاہر گونگا عزیزہ ملک کتنا باتونی ہے۔ اس کی باتوں میں کتنا رس ہے۔ اس کا مزاح کس قدر مفرح ہے۔ اس کی طنز کی دھار میں کتنی کاٹ ہے۔

"راول دیس" کے مضامین عزیزہ ملک کے ادبی تخیل اور کلام کا ایک نمونہ ہیں۔ مکمل تصویر نہیں۔ چونکہ لکھتے لکھتے اُسے شبہ پڑ جاتا ہے کہ آپ یہ مضامین پڑھ لیں گے۔ تنہائی کی یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے اکیلے پن کی ہوائی مفقود ہو جاتی ہے۔ مد و جزر اُٹھتا ہے۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔

اکیلے ادیب کا المیہ بھی عجیب ہے۔ وہ کہنے کو ترستا ہے مگر سنانے سے ڈرتا ہے

اکیلا یا تو دیوانہ ہوتا ہے یا تخلیقی اور یا دونوں ـــــ
عزیز ملک دونوں ہے۔ دیوانہ بھی تخلیقی بھی۔ شاید تخلیقی صلاحیت کی قیمت دیوانگی ہو۔ کون جانتا ہے۔ شاید ان دونوں خصوصیات کی حیثیت دھوپ چھاؤں کے مترادف ہو لیکن چھاؤں تو وجود نہیں رکھتی وہ تو دھوپ کی وقتی عدم موجودگی کا نام ہے۔

عزیز ملک نے تین چیزیں ورثہ میں پائیں۔ یہ ورثہ مال و اسباب یا جائداد کا سا ورثہ نہ تھا۔ ملکیت تو تھی۔ مگر عزیز ملک کی نہیں بلکہ ورثہ کی۔ عزیز ملک اس ورثہ کے ہاتھ میں یوں بے بس تھا جیسے بچے کے ہاتھ میں چڑیا ہو۔ یہ تین چیزیں عزیز ملک کی ہڈیوں میں رچی ہوئی ہیں۔ ایک طب دوسرے اسلام تیسرے ادب۔ طب و اسلام براہ راست والد مرحوم نے عطا کئے۔ ادب کسی دادا پر دادا کی دین ہے ـــ ممکن ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ڈربے میں ساتھ ساتھ پروان پاتیں۔ لیکن بدقسمتی سے بچپن میں کسمپرسی کے ماحول نے حفظ ماتقدم کے تحت اُسے مطالعہ میں پناہ لینے کی چاٹ ڈال دی اور پیشتر اس سے کہ اُسے احساس ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ طب اسلام اور ادب پر وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔

اعتقاد کی شدت تو ازلی طور پر ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔ وسعت نگاہ مطالعہ نے بخشی۔ دونوں سوکنیں ایک ہی گھر میں رہنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تُو تُو میں میں شروع ہوئی۔ برتن ٹوٹنے لگے۔ غل غپاڑہ

ہوا۔ بیچارہ کیا کرتا ــــ میاں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی آنکھیں موند لیں اور یقین کر لیا کہ گھر میں سب خیریت ہے ــــ پھر بھی اس کی گردن لٹک گئی کمر خمیدہ ہو گئی۔

آج بھی عزیز ملک کو سرِ راہ گزرتے ہوئے دیکھئے۔ اکیلا بندبند سر لٹکا ہوا کمر خمیدہ یوں نکل جاتا ہے جیسے کٹا ہوا پتنگ ہو۔

اس کے باوجود عزیز ملک نے مطالعہ کی لت نہیں چھوڑی۔ آج بھی اس کا واحد شوق مطالعہ ہے۔ اسلام اور ادب کا مطالعہ۔ بے مقصد مطالعہ۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہے مگر ہے کہ ابتدائی دور میں مطالعہ شکوک اور شبہات کو ہوا دیتا ہے۔ تخیل میں رنگ بھرتا ہے۔ عمل سے دور لے جاتا ہے۔ ثانوی دور میں شکوک و شبہات کو صاف کرتا ہے تخیل اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اکثر لوگ جو ثانوی دور تک نہیں پہنچ پاتے۔ شکوک و شبہات کی بھلبھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ بہر صورت یہ حقیقت ہے کہ جب تک پیدا نہ ہوں۔ شکوک شبہات دور نہیں ہو سکتے۔

شدتِ ایمان کے ورثہ کی وجہ سے مطالعہ کے اولیں دور میں بھی عزیز ملک میں شکوک و شبہات نہ ابھرے۔ ابھر نہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی دور کو طے کرنے کے باوجود اس کے دل میں بے نام تذبذب کی گھٹن باقی رہی۔ اب بھی ہے۔

پرانے زمانے کی بات ہے۔ پنجاب کے کسی علاقے میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ ریاست میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اناج وافر تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ لوگ خوشحال تھے۔ راجہ خوشحالی پر پھولے نہ سماتا لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھار بیٹھے بٹھائے راجہ کو شک پڑجاتا کہ حالات تسلی بخش نہیں ہیں اور وہ فکر مند ہو جاتا۔ ایک روز جب راجہ اپنے درباریوں کے ساتھ کسی اہم تقریب پر جارہا تھا تو دفعتہً وہی کیفیت وارد ہو گئی۔ وزیر سے کہا۔ دیکھو ہمیں کسی نے یاد نہ دلایا اور ہم سر پر پگڑی رکھے بغیر ہی آ گئے۔ پگڑی کے بغیر تقریب میں شمولیت کرنا کتنا معیوب ہوگا۔ یہ سن کر وزیر نے خدمتگار کو حکم دیا۔ محل میں جاؤ اور مہاراج کی پگڑی لے آؤ۔ جب تک ہم یہیں انتظار کریں گے۔

اتفاقاً کسی درباری کی نگاہ راجہ کے سر پر پڑی دیکھا کہ پگڑی راجہ کے سر پر ہے۔ درباری نے عرض کیا۔ حضور پگڑی تو سر مبارک پر موجود ہے۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر پگڑی کو ٹٹولا۔ پا کر اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگا بہت اچھا کیا کہ تم نے ہمیں بتادیا۔ ورنہ ہم یہاں ننگے سر ہی کھڑے رہتے۔

عزیز ملک سے پہلی ہی ملاقات میں میں نے اس کے سر کی پگڑی دیکھ لی۔ اس پگڑی میں اسلامی علم و عمل کے چند ایک ایسے حاشیے بھی تھے کہ میرے دل میں عزیز ملک کے لئے احترام سا پیدا ہو گیا۔ ورنہ میں اس کا دوست بن جاتا اور حسبِ عادت موقعہ ملے

موقعہ اُسے ادب ادا کر کے کہتا ہوش کر ننگے سر کیوں کھڑا ہے۔ اندھے
پگڑی تو تیرے سر پر ہے اور شاید بات اس تک پہنچ جاتی۔

پتہ نہیں کیوں اگر آپ احترام کے ساتھ مہذب انداز میں کہیں
کہ حضور پگڑی تو آپ کے سر پر ہے تو سننے والے کو یقین نہیں آتا
یا کہنے والے کی بات میں اثر پیدا نہیں ہوتا۔ تو تڑاق بے ادبی ہی
لیکن تیر نشانے پر بیٹھتا ہے۔ اثر کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

جب میں عزیز ملک سے متعارف ہوا۔ ان دنوں میں آزاد تھا
آوارہ تھا منتول تو تھا۔ بادبان نہ تھے۔ جب بادبان ہی نہ ہوں
تو ہوا چلے نہ چلے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ مجھے راہ کا احساس تھا نہ شعور
تھا نہ تلاش تھی۔ اس کے برعکس عزیز ملک آوارگی سے ناواقف تھا
اگرچہ وہ ازلی راہ رو تھا۔ راستے کی کتنی ایک پگڈنڈیاں ناپ چکا
تھا۔ راستے کی دھول سے اٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے اس دشت نما راستے
پہ لے گیا۔ ہم دونوں کا جوڑ بھی عجیب تھا۔ لے جانے والا میلا دیکھ
کر لوٹا تھا۔ جانے والا میلا دیکھنے جا رہا تھا۔ نہ جانے میلے کا نیاپن
تھا یا کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے بادبان لگ گئے۔ ہوا چلنے لگی۔ راستے
کا مفہوم پہلی بار آنکھوں کے سامنے آیا۔ ڈگر کی اوٹ میں بیٹھے
ہوئے کسی شعبدہ باز نے ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ آنکھوں میں
سرسوں پھول گئی۔ لیکن یہ قصہ تو علی پور کے ایلی کی دوسری جلد کا
موضوع ہے۔

بہر حال عزیز ملک کے توسط سے میں اس نئی ڈگر تک پہنچا۔ عزیز ملک میرے لئے سنگ میل بن گیا۔ گویا تو تشاف کا تعلق پیدا کرنے کے امکانات بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز ملک ننگے سر ہی کھڑا رہا۔

حفیظ جالندھری عزیز ملک کے پرانے دوست ہیں ایک روز جب میں نے حفیظ کی موجودگی میں اُسے یاد دلایا کہ ملک پگڑی تو تیرے سر پہ ہے تو حفیظ مجھے کھینچ کر اکیلے میں لے گیا۔ کہنے لگا مفتی ممتاز اسے پگڑی کا یقین نہ دلا اگر اسے یقین آگیا تو اس کے سر پہ اتنا بوجھ پڑ جائے گا کہ یہ اسے سہار نہ سکے گا۔۔۔ شاید وہ رمز آشنا سچ کہتا ہو۔ لیکن شاید۔۔۔ حفیظ میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ شعر سوچے بغیر کہتا ہے اس لئے ابوالاثر ہے۔ بات سوچے بغیر نہیں کرتا۔ اس لئے ابوالکلام ہے۔ برسوں کی جان پہچان کے باوجود حفیظ آج تک مجھے مفتی ممتاز کہہ کر بلاتا ہے۔

شاید عزیز ملک کے سر پہ پگڑی کے بوجھ کی بات اُس نے ایسے ہی سوچ سمجھ کر کہی ہو جیسے میری آمد پر وہ سوچ سمجھ کر مفتی ممتاز کہا کرتا ہے ممتاز مفتی کے وجود کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔

عزیز ملک کو یہ شکایت ہے کہ حالات نے اُس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اُس کی یہ شکایت بالکل درست ہے واقعی حالات نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ حالات نے اس کے ساتھ صریحاً

بے انصافی کی ہے۔ بچپن میں عزیز ملک کو لاڈ پیار نہ ملا۔ بے فکری کی کیفیت میسر نہ آئی۔ تنگی ترشی۔ سخت گیر باپ۔ خشک زہد سے بھرا ہوا گھر — انا میں ڈوبا ہوا گھر والا۔ کڑکڑا ضبط۔ عزیز ملک اور چاروں طرف چھائی ہوئی کس مپرسی۔

پھر اسی کا کلکتہ دفتر میں عزیز ملک کے ماتھے پر کلرکی کا کلنک لگا جس کا نقشہ "راوی دیس" میں اس نے فن کارانہ انداز میں کھینچا ہے کلنک کا یہ ٹیکہ کسی کو دکھائی نہ دیا۔ لیکن عزیز ملک اُسے اُٹھائے پھرتا رہا۔ آج بھی اُٹھائے پھر رہا ہے۔

ہاں حالات نے عزیز ملک کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی کی لیکن عزیز ملک کے ساتھ اس سے بھی بڑی بے انصافی خود عزیز ملک نے کی۔ اب بھی کر رہا ہے۔ نہ جانے کب تک کرتا رہے گا۔ سر کی پگڑی جو دکھتی تھی نہ دیکھی کلرکی کا کلنک جو نہ دکھتا تھا۔ دیکھتا رہا۔ تخیل اور کلام کا ادب جو واضح تھا نہ دیکھا۔ چھپنے کی خواہش کو جس کی حیثیت ضمنی تھی حسرت بنا کر سینے سے لگائے رکھا۔

عزیز ملک کی کیفیت اس بچے کی سی ہے جسے پورا حصّہ نہ ملا اور جو ملا وہ اس نے احتجاجاً یہ کہہ کر لوٹا دیا — "پورا نہیں دیتے تو یہ بھی لے لو۔"

شاید یہ بھی درست ہو کہ عزیز ملک کو پورا حصّہ نہیں ملا۔ لیکن عزیز ملک کو بھرپور حصّہ ملا۔ ورثہ میں اسلام طلب اور ادب جو آباد

نے عطا کیا۔ مطالعہ جو ناخوشگوار بچپن نے دیا۔ عزیز ملک کو ذہن اور کردار کی صلاحیتیں عطا ہوئیں۔ علم و ادب کے ساتھ عمل کی توفیق ملی۔ ایمان کے ساتھ وسعتِ نگاہ ملی۔ بڑے ادیبوں اور شاعروں کا قرب حاصل ہوا۔ بزرگوں اور اولیاء نے پاس بٹھایا۔ شریعت اور طریقت دونوں مزے چکھنے کو ملے۔ قلم میں تاثیر ملی۔ بڑے ادیبوں اور شاعروں کا قرب حاصل ہوا۔ بزرگوں اور اولیاء نے پاس بٹھایا۔ شریعت اور طریقت دونوں مزے چکھنے کو ملے۔ قلم میں تاثیر ملی۔ زبان میں اثر ملا۔ اتنا کچھ ملا۔ لیکن وہ یہ نہ بھول سکا کہ کیا نہیں ملا۔ کلرکی کے ٹیکے کو نہ بھول سکا۔ پگڑی سر پر ہونے کے باوجود ننگے سر ہی کھڑا رہا۔ بدقسمتی سے ایسے دوست ملے جنہوں نے اُسے یہ یاد دلانا خلافِ مصلحت سمجھا کہ پگڑی تو اُس کے سر پر ہے۔ لیکن شاید یہ احساسِ محرومی بھی قدرت کی ایک دین ہو تاکہ ناسور رستا رہے درد اُٹھتا رہے۔ ٹیس جاری رہے تاکہ نغمہ پیدا ہوتا رہے۔

یہ تعارف عزیز ملک کی شخصیت کا ہے۔ ان فن پاروں کا نہیں جو "راول دیس" میں درج ہیں۔ شخصیت کی یہ تجزیاتی جھلکیاں بھی میرے ذاتی تاثرات ہیں۔ ممکن ہے یہ تاثرات کہیں کہیں حقیقت سے لگا کھاتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں حقیقت سے دُور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ بہرصورت ایک بات مسلّم ہے کہ مجھے عزیز ملک کی شخصیت پر لکھنے کا حق حاصل ہے۔

آخر میں عزیز ملک کے ان فن پاروں کے متعلق میں یہ کہہ کر بات ختم کر سکتا تھا کہ وہ آپ کے پیش ہیں اور مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ـــــ اگرچہ میں عطار نہیں ہوں پھر بھی "راول دیس" کے اس تعارف میں مجھے عزیز ملک کی تصنیف پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا ورنہ لوگ کہیں گے مفتی نے عزیز ملک کی شخصیت کی ڈگڈگی بجائی لیکن رسمی تنقید کا سانپ نہ نکالا۔

آپ سے کیا پردہ ہے کہ میں رسمی تنقید اور رسمی تحریر دونوں ہی سے بیگانہ ہوں لیکن کیا کیا جائے رسم دنیا۔ موقعہ اور دستور کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ـــــ "راول دیس" میں انشائے لطیف کی گلکاری پر فکر کے بیل بوٹے بھی ہیں اور تخیل کے ہیولے بھی سنجیدگی بھی ہے ظرافت بھی۔ پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ لیکن طنز کے تیر و نشتر ان تحریروں کی جان ہیں۔

یہ پھول ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ وہ لڑی پنڈی کے بیتے ہوئے دنوں کا ثقافتی ماحول ہے۔ عزیز ملک کو پنڈی اور اس کے نواحی علاقوں سے والہانہ محبت ہے اور اس دیس کے مفلوک الحال لوگوں سے بے پناہ لگاؤ ہے۔

"راول دیس" کے عوام کی حکایات بیان کرتے ہوئے عزیز ملک کی آنکھوں میں سوڈے کی بوتلیں کھل جاتی ہیں۔ پھر وہ جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر اپنے منفرد طرزِ بیان کی رنگ پچکاری سے ہولی

کھیلتا ہے اور محفل کو گلنار بنا دیتا ہے۔

دقیق مطالعہ ہو یا انشائیے لطیف خاکہ ہو یا افسانہ ہر صنف ادب میں عزیز ملک کا اسلوبِ بیان منفرد ہوتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور بندش جملوں کی تشکیل و ترتیب۔ اسالیب بیان اور صفات و تراکیب ہر بات پر عزیز ملک کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔

عزیز ملک زندگی میں جس قدر سادہ اور پھیٹچر ہے۔ میدانِ ادب میں اتنا ہی شوقین مزاج اور شوخ ہے۔ زندگی میں سر لٹکا کر راستہ ناپتا ہے۔ تحریر میں راہ چلتوں کو چٹکیاں بھرتا ہے۔ مسخریاں کرتا ہے۔ فقرے کستا ہے ساتھ ساتھ قاری کو آنکھ مار کر کہتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو۔ ادب کی سرزمین میں وہ یوں بے تکلف گھومتا ہے جیسے کوئی الھڑ مٹی مونڈھے مار مار کر جھوٹی جھولنی میلہ گھوم رہی ہو۔

دنیائے حقیقت کی محرومیاں دنیائے تخیل کی حصول یابیاں حق بحق دار رسید بے شک عزیز ملک خصوصی سٹائل کا مالک ہے۔ ہر موضوع پر اندازِ بیان کی رنگینی جوں کی توں قائم رہتی ہے لیکن زاویۂ نظر موضوع کے اعتبار سے بدل جاتا ہے "چھاؤنی کی کہانی" "سات ناٹ" اور جادو نے بنگالہ میں وہ طنز کے پٹاخے چلاتا ہے۔ مگر روحانی فضا میں وہ ادب و احترام کا لبادہ پہن آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے "ادبی ماحول" میں مزاج کی لطافت غالب ہو جاتی ہے اور تجسس و تحقیق کی چاندنی بچھ جاتی ہے۔

بے شک عزیزہ ملک کی تحریر میں رنگینی بھی ہے اور روانی بھی۔ لیکن ابھی تک کہیں کہیں بے اعتمادی جھجک دبہ دبہ غصہ اور جذباتی شدت کے واضح نقوش ملتے ہیں جو اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ابھی تک اس نے زمانے کی بے انصافیوں کو معاف نہیں کیا۔ ابھی تک وہ اپنے شانوں پر خیالی محرومیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرتا ہے۔ ابھی تک وہ ننگے سر کھڑا ہے۔ جس روز عزیزہ ملک نے اس خیالی محرومی کے جُوئے کو سر سے اُتار پھینکا۔ اُن موہوم بیڑیوں سے آزادی حاصل کر لی۔ اُس روز اس کی تصنیفات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔

۷۸۹

"چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا"

یہ پنڈی ہے

اور پنڈی اُس وقت بھی موجود تھی جب ریڈیو سے "یہ راولپنڈی ہے" کی گردان شروع نہ ہوئی تھی —— لیکن یہ پنڈی کیا تھی؟ ہم ان اوراق کی آرسی میں اس کا ناک نقشہ دیکھیں گے ——

بزرگوں سے روایات میں یہ بات سُنی تھی کہ جس طرح پتھر کو جونک نہیں لگتی اسی طرح پنڈی کی سرشت میں شہر بننے کی صلاحیت مفقود رہی ۔ شاید اس آب و گل کی جبلی نہاد اور فطری اُفتاد کچھ ایسی ہے کہ مٹی کے اندر پودوں کو چاٹنے والے دیمک زیادہ اور قوتِ نامیہ کا کیمیائی عنصر کم اور پانی میں آکسیجن کی جگہ مٹی کا تیل وافر مقدار میں پایا

جاتا ہے۔ پھل دار درختوں کی کمی ہے۔ صرف توت اور بیر کے درخت ملتے ہیں (اور بیر کو پوٹھوہاری لہجے میں بیر پکارتے ہیں)
دامنِ کوہ میں واقع ہونے کی وجہ سے نزلہ و زکام کی وارداتیں کثرت سے ہوتی ہیں اور لوگ اس وبا کا تدارک کرنے کی خاطر حقے تمباکو کا شوق رکھتے ہیں۔ اس لئے منشیات کا بیوپار سال بھر عروج پر رہتا ہے تاجرانِ حقّہ تمباکو نہ صرف خود طبعی طور پر محقق پائے جاتے ہیں بلکہ ان کے نگارخانوں سے پنجابی چھوڑے۔ کھڑے نیچے کے گردن دراز پشاوری شوٹے۔ لکھنؤ کے مدار پیے۔ شکب پیچواں رنگارنگ گڑگڑیاں حیدرآبادی فرشیاں۔ روہیل کھنڈ کی کاغذی چلمیں اور رامپور کے خوشبودار خمیرے بافراط مل جاتے ہیں ——— ان میں سے ہر نوع بجائے خود ایک تمدنی عنصر کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ برصغیر کے طول و عرض سے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر فرد اپنی امنگوں کا پشتارہ لاد کر لایا اور منزل پر پہنچتے ہی نگر نگر کے باسیوں نے اپنی اپنی لیلا رچادی جس کے ملغوبے سے آگے چل کر ایک باغ و بہار معاشرے نے جنم لیا۔ ان میں بیت بازوں کی ٹولیاں تھیں اور پورب پچھم کی بولیاں ٹھولیاں بھی۔ ان میں چڑی مار چرسی بھنگی اور ڈھوم ڈھاڑی بھی تھے۔ کھاٹ بڑھئی گھسیارے دفالی بنجارے۔ بڑ قصاب اور بریلیے بھی۔ مولوی بھی تھے فاضل جاہل اور شاعر بھی گویا بزم میں اہلِ نظر بھی تھے تماشائی بھی ——— ایک وہ شہر

تھا جس میں راہی آئے اور مقامی بن کر رہ گئے۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ آبادی تھی۔ ایک چھوٹی سی خبر تبھی نالا بب سے اُڑتی اور مورگاہ تک جا پہنچتی۔ ہم کہیں چھپ کر بھی سگریٹ پیتے تو گھر والوں کو اطلاع ہو جاتی کہ صاحبزادے میاں نے فلاں پنواڑی سے دو پیسے میں ایک گولڈ فلیک قینچی کا سگریٹ خرید کر شوق فرمایا ہے۔ یا تو لوگوں کی سرشت ہی "چغل خور" قسم کی رہی ہوگی کیونکہ انگریز نے اپنی ضرورتوں کے پیش نظر چھاؤنی ڈالی تھی اور اس کی حفاظت کے لئے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ لوگوں نے جاسوسوں سے اُن کا فن غیر شعوری طور پر سیکھ لیا تھا یا پھر معاشرہ ہی کچھ ایسا تھا کہ لوگ اپنے بچوں کی طرح دوسروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔

چھاؤنی کے اندر روزگار کی تلاش میں نگر نگر کے لوگ آن بسے تھے۔ ملازمت پیشہ اہلِ حرفہ اور تاجر وغیرہ ۔ تاجروں کا ایک طبقہ پھیری والوں کا تھا۔ یہ انگریزوں کے بنگلوں پر ہانک لگاتے اور روپے کے دو وصول کرتے۔ صدر میں اسی رجحان نے شہر کے اندر اجارہ داری بنا رکھی اور تھوک فروشی کا بازار گرم کیا۔ اصل میں صدر کو اپنی بقا کے لئے شہر کی ضرورت تھی تاکہ وہاں سے سستا مال خرید کریں اور صدر کے حدود میں منہ مانگے دام وصول پائیں۔ اس ذہنیت کے خمیر سے لوگوں کا خاص مزاج ترکیب پاتا گیا۔

اس مزاج کی رنگا رنگی سٹی صدر روڈ پر پوری شان سے جلوہ گر

تھی۔ کیونکہ شہر کو صدر سے ملانے والا یہ درمیانی برزخ بوقلموں مظاہر کا آئینہ دار تھا۔ سیڑھیوں کے پل سے اترتے ہی تانگے والوں سے ملاقات ہوتی جو دو پیسے لے کر راجہ بازار پہنچا دیتے بلکہ مندے واڑے کا ایسا دور بھی ہم نے دیکھا کہ ایک ہی پیسے میں سواری اٹھانے لگے۔

نالہ لئی کے پل سے روز سینما تک گنتی کے چند گودام عمارتی لکڑی اور بانس فروشوں کے ہونگے۔ باقی اڈے مختلف سفری مسخروں نے قائم کر رکھے تھے۔ یہاں وہاں ایک آدھ پیسے میں حجامت بنانے والے خاندانی حجام چٹائیاں بچھائے اُسترے چلانے میں مصروفِ کار ہوتے۔ بہت سے سکھ نجومی سُرخ سُرخ پگڑیاں باندھے نظر آتے وہ اہلِ شوق کے ہاتھوں کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے اور پانچ آنے ہتھیا لیتے۔ کسی دیوار کے ساتھ کوئی خضر صورت بزرگ ٹیک لگائے۔ پشت پر کتبہ لٹکائے۔ سامنے چند لفافے پھیلائے۔ ایک طوطے کو پنجرہ میں سجائے۔ گھات لگائے بیٹھا ہوتا۔ کتبہ پر تحریر ہوتا۔ "علم غیب کا جاننے والا خدا ہے لیکن آئیے یہ طوطا آپ کی قسمت کا حال بتائے گا۔"

کہیں کوئی چرب زبان مجمعی "آئیے صاحبان مہربان قدر دان" کے شہرہ آفاق الفاظ سے لیکچر کی ابتدا کرنے والا اور آخر کار گل بادیان کا منجن بیچنے والا بھی کھڑا ہوتا جو کفایت شعار بزرگ "تانگے کے دو پیسے بچانے کی اُمید پر پیدل چل نکلتے وہ کسی ایسے ہی مجمعے پر

دو چار آنے گنوا کر آگے بڑھتے۔ کسی گوشہ میں تاش کے پتے پھینٹے اور باون (۵۲) میں سے ایک کی شناخت کرنے والا مداری دادِ کمال لیتا۔ اور ٹین کے خالی ڈبے پر نظرِ فیض اثر کا جھرلو پھیرتا تو ٹین میں چھاچھن روپے گرنے کی آواز سنائی دیتی لیکن حاصل وہی ڈھاک کے تین پات آخرش دامن پھیلا کر نظرِ مولا اور سخی کی جان کا صدقہ دھیلا پیسہ مانگ کر اپنی راہ لگتا۔ بہت زمانہ ہوا یہاں نٹوں کی ٹولی آئی اور رسّی پر چھپکلیوں کی طرح اُچھل کود کا تماشہ دکھا کر خراجِ زر وصول کرتی رہی۔ اس ٹولی میں ایک نٹ کھٹ نٹنی بھی تھی جو لیلیٰ کی ہم رنگ تھی۔ وہ رسّی کے اوپر فضا میں بلکہ نزدِ خدا ہو کر ناچ مجرا دکھاتی اور تالی میل کرتی۔ تونگر آنے دو آنے کو کیا سمجھتے ہیں۔ کھنا کھن دھن برستا۔ یہ موج میلہ سہ پہر سے شام ڈھلے تک رہا کرتا۔ ساتھ ساتھ لطیفے بازیاں ہوتیں۔ ایک روز نٹنی نے بانس پھلانگ کر ادائے ناز کی خاطر انگڑائی لی ہی تھی کہ مجمع سے ایک زندہ دل پکارا۔ "لیلیٰ نہ جانا بام پر چاندنی چھو جائے گی۔ میلا بدن ہو جائے گا،" قہقہے بلند ہونے لگے لیکن نٹنی منہ پھٹ تھی۔ کھٹ سے بولی "ارے ۔۔۔ تیرا یہ منہ۔ دودھ پینے والے مجنوں کسی تماش بین ماں کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ چل شکل گم کر کہیں نظر نہ لگ جاتے"۔ اگلے روز شامتِ اعمال وہ سیاہ فام نٹنی بنفشی رنگ کی ساڑھی پہن کر آگئی۔ ابھی تان لگائی ہی تھی کہ اُسی شخص نے گزشتہ شام کا بدلہ چکانے کے لئے سُر ملا کر کہا۔

"آج سرسوں کے کھیت میں بھینس گھس آئی ہے۔" نمّی کا مُنہ لٹک گیا۔

راجہ بازار کی طرف سڑک کے کنارے سے جہاں اب ایک نابالغ سا پارک بن گیا ہے۔ پہلے سفیدہ زمین تھی۔ جہاں تانگے کھڑے ہوا کرتے اور تماشائی بھی جمع رہتے۔ یہاں ہر روز ایک شخص پانچ من وزنی پتھر اپنی چھاتی پہ رکھنے کا شعبدہ دکھایا کرتا۔ مجمع جمانے کے بعد حرفِ مطلب کہتا اور حاضرین سے آٹھ آنے طلب کرتا۔ صرف آٹھ آنے۔ بتیس پیسے ایک دھیلی یعنی نصف روپیہ اُن دنوں نصف روپیہ بھی بڑی شے تھا۔ مزدور سارا دن اینٹیں ڈھوتا اور چھ آنے پاتا۔ لیکن پانچ من گناہوں کا بوجھ اُٹھانے والا یہ بادگیر گھنٹے آدھ گھنٹے میں اٹھنّی بنا کر لے جاتا۔ لوگ آنہ ٹکا پھینک کر بتیس پیسے کی فرمائش پوری کرتے اور وہ سینڈو پتھر چھاتی پہ رکھ کر داد طلب نگاہوں سے مجمع کو دیکھتا۔ لوگ بھی دم بخود کھڑے دیکھتے۔ آخر میں وہ پتھر کو چھاتی سے سرکاتا اور دامن جھاڑ کر حاضرین سے کہتا۔ کسی شخص کے پاس سگریٹ ہو تو مجھے دے تاکہ میں یہ وزنی پتھر سگریٹ کی نوک پر کھڑا کر کے دکھاؤں۔ اس کمال کا نظارہ کرنے کے لئے لوگ والہانہ جوش و خروش کے ساتھ سگریٹ پیش خدمت کرتے۔ وہ ہر ایک کی پیش کش کو خندہ پیشانی قبول کر کے جیب کے گودام میں ذخیرہ کر لیتا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر آداب بجا لاتا اور السلام علیکم کہہ کر مجمع سے روانہ ہو جاتا یعنی کھیل ختم اور پیسہ ہضم۔

اسی مٹرک پروٹو منڈوے بھی تھے جن میں کبھی کبھار بہار آ جاتی۔ ایک کے اندر آغا حشر اور دوسرے میں ماسٹر رحمت کے ڈرامے کھیلے جاتے۔ اس طرح دو ناٹک کمپنیوں میں تقابلی دوڑ شروع ہو جاتی۔ جب لوگ بور ہونے لگتے اور کاروبار مندا پڑ جاتا تو ان کمپنیوں کا ڈیرا لد جاتا۔

شہری آبادی میں ۱۹۲۶ء کے اندر پہلے پہل "روز سینما" کے نام سے بائسکوپ کھلا۔ صدر میں دو سینما اس سے پہلے موجود تھے لیکن ان میں صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ جیسا کہ وضاحت ہو چکی۔ پنڈی کے شہری بڑے لہری واقع ہوئے تھے خالص افیون کا بھاؤ سوا روپے تولہ تھا اور اتنا غضب ہونے کو رتی دو رتی بھی بہت ہوتی ہے۔ بھنگ کا پیالہ بھی آنے ٹکے میں مل جاتا۔ خاصہ غریب پرور دور تھا۔ ویسے وہسکی اور ایکشا نمبر ایک کے ٹھیکے موجود تھے اور بازاری کلالوں کی بھی کمی نہ تھی۔ غنڈے موتیئے کے ہار پہن کر شام کے وقت گلاس چڑھا کر تانگوں میں سیر کو نکلا کرتے۔ ہاؤ ہو کا سماں رہتا۔ خنجر زنی بھی ہوتی۔ سر پھٹول کا ہنگامہ تو گویا روز مرہ میں داخل تھا۔ نامور غنڈے کمینے نہ تھے بلکہ وقار کے ساتھ مار دھاڑ کرتے۔ ٹولیاں ٹولیوں پر یلغار کے لئے للکار کر نکلتیں۔ یوں تو ہندوؤں میں بھی غنڈے موجود تھے۔ کہاں وہ بات مگر مولوی مدن کی سی مسلمان غنڈوں سے ہندو مہاجن خائف رہا کرتے اور بعض نے ان

کے روز یئے اور لاہور مشاہرے باندھ رکھے تھے تاکہ جان کو امان ملے۔ میں دو تین نامی گرامی غنڈوں کا حال بیان کرتا ہوں۔

ایک ہاکی کا بے مثل کھلاڑی ننھا بدمعاش تھا۔ میں نے ثقہ لوگوں سے سُنا ہے۔ اگر غنڈہ پن اس میں نہ ہوتا تو دھیان چند سے بھی اچھا کھلاڑی بن کر شہرت کے آسمان پر آفتاب کی طرح چمکتا۔ لیکن اس کے دماغ کی کوئی کل ٹیڑھی تھی۔ غصّہ اور غضبناکی کا یہ عالم کہ جوانی میں دس دس پندرہ پندرہ دھگڑوں سے خالی ہاتھ جو کبھی لڑتا اور سب پر غلبہ پالیتا۔ بنارس کے ہندو راجہ کو کسی ہاکی میچ میں اس کا کھیل پسند آگیا۔ اور اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن ننھا اوّل و آخر غنڈہ تھا راجہ کی بھاوج سے عشق لڑا بیٹھا۔ راجہ نے خوب پٹوایا اور قید کر دیا لیکن قید سے چھوٹتے ہی محل کے باہر ڈیرے ڈال کر بیٹھ گیا۔ راجہ نے پھر ہڈیاں سہلائیں اور شاہی مہمان خانے بھجوا دیا۔ اس طرح کئی مرتبہ آہنی سلاخوں کے پیچھے آیا گیا۔ اسی ادھیڑ بُن میں دس پندرہ برس گزر گئے اور جوانی بیت گئی آخر راجہ کے چوبدار لاہور لاکر چھوڑ گئے۔ وہاں سے ۳۴ سنہ میں ننھا آگیا۔ جنہوں نے اس کی جوانی دیکھی تھی کانپ گئے۔ پولیس بھی چوکس ہو گئی۔ لیکن ننھے خاں کے شعلے بجھ چکے تھے مسلسل قید و بند سے دماغ باختہ ہو گیا تھا۔ پرانی عادت سے مجبور ہو کر ایک آدھ ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے اپنے وقت کی بات ہوتی ہے۔ اس کا زمانہ بیت لیا تھا۔ پرانا سکہ آخر کب تک

چلتا۔ لوگوں نے مُنہ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ پولیس نگرانی کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈی میں جہاں کبھی اس کا طوطی بولا کرتا تھا۔ وہاں اُسے لوگوں نے چلچلاتی دھوپ میں شانے پر کمبل لٹکائے ننگے پاؤں بازاروں میں بھیک مانگتے دیکھا۔

بھوندا ایک اور خطرناک غنڈا تھا۔ اس نے رواں صدی کے آغاز میں اپنے جھنڈے گاڑ دئیے۔ چوری ڈاکہ سینہ زوری قتل اور غارت گری میں یگانۂ روزگار تھا۔ سانجھ سویرے کسی مہاجن کے دوارے جاتا۔ ہزار دو ہزار طلب کرتا۔ انکار کی مجال بھلا کس ماں کے لال میں تھی۔ ہاتھ جوڑ کر نذرانہ جھولی میں ڈالتا اور اگر لیت و لعل کرتا۔ بھوندا اُسی رات ڈاکہ ڈال کر ساری پونجی سمیٹ لے جاتا۔ قفل شکنی کی اُسے خاصی مشق تھی۔ علی گڑھ کے تالے کی حقیقت کیا ہے قلعہ میگزین کے کمانی دار تالے اس کے ہاتھوں عاجز و ناتواں تھے۔ ایک مرتبہ چوری کی واردات میں گرفتار ہوا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران انگریز جج نے اُسے پوچھا۔ "تم تالہ کیسے توڑتے ہو۔" بھوندا نے سوج میں آ کر کہا لاؤ توڑ کر دکھا دوں۔ مال خانے سے بھاری بھرکم تالہ منگوایا گیا۔ بھوندا نے تالے کو ہاتھ میں لیا اور رومال سے ڈھانپ کر جھٹکا دیا۔ کہ تالے کے پُرزے اُڑ گئے۔ جج نے فیصلے میں لکھا۔ " Lock is afraid of Bhonda "

"تالہ بھوندا سے ڈرتا ہے۔"

ہوتے ہوتے ڈکیت اور قتل کے ایک مقدمہ میں عبور دریائے شورہ کی سزا پائی۔ بیس۲۰ برس کے بعد واپس آ کر آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کا عہد کیا۔ لیکن محنت اور مشقت کا عادی نہیں تھا۔ کہیں قدم جم نہ سکے۔ بالآخر اس کی غنڈہ گردی نے اپنے حسب حال ایک چال سوچی اور تعویذ گنڈے کا دھندا شروع کر کے پیر بھوندے شاہ بن گیا۔ اس بزنس میں اُسے اتنی فارغ البالی نصیب ہو گئی کہ بڑھاپے میں شادی کر لی۔

ایک اور اُستاد دین تھا جس کے بہت سارے شاگرد تھے لاہور کا رہنے والا تھا لیکن بُری صحبت میں تباہ ہو کر منڈی آ گیا۔ ایک غلیظ سا ہوٹل کھولا۔ ہوٹل تو وزن بیت کا بہانہ تھا اصل کام اس کا چرس کی خرید و فروخت تھا۔ آدمی معاملہ فہم تھا۔ پولیس کا تعاون حاصل کر لیا۔ پولیس کے کارندے وقت بے وقت مال پانی کے لئے اس کے ہوٹل پہ آنے جانے لگے۔ اس گٹھ جوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ چرس یعنی چاہ رس کے رسیا کھلے بندوں گولی خریدتے اور شوق پورا کر کے چائے بھی پیتے۔ کبھی کبھار پولیس سے بگاڑ ہو جاتا تو چھاپہ پڑتا لیکن اُستاد دو اڑھائی تولہ وزنی چرس جو فوری ضرورت کے لئے جیب میں ہوتی نگل لیتا۔ پولیس کو عدم ثبوت کی وجہ سے ناکام جانا پڑتا۔

شیخ فضل قادر سب انسپکٹر پولیس ایک مرتبہ جھنجھلا کر الیاس کی دف

ہوا کہ اُستاد چکرا گیا۔ بہت کوشش کی مگر فضل قادر رام نہ ہوا چرس کا کاروبار اُستاد کی معیشت کا واحد آسرا تھا۔ جب یہ معیشت مضطرب ہونے لگی تو اُستاد نے انتقام کی ٹھانی۔ لال کُرتی میں ایک روز بڑا دنگل ہونے والا تھا اور فضل قادر کی وہاں ڈیوٹی تھی۔ اُستاد اپنے ہوٹل سے اُٹھا اور شاگردوں سے کہا اگر میں آج گرفتار ہو جاؤں تو فکر نہ کرنا۔ یہ کہہ کر منزلِ مقصود کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر بلا ٹکٹ اندر داخل ہونے لگا۔ فضل قادر ایک جابر تھا بندا نہ تھا۔ اُس نے گالی بھی دی اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اُستاد نے کہا "فضل قادر جی میں ایک غنڈہ ہوں۔ لبتہ السٹ کا نمبری بدمعاش۔ آپ مجھے روکنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اقتدار بھلا غنڈے کی دھمکی کو کیا خاطر میں لاتا۔ فضل قادر نے ہنٹر ہوا میں لہرایا ہی تھا کہ اُستاد نے آگے بڑھ کر زوردار ٹکر ماری اور چلبیہ لگا کر رکھ دیا۔ پھر گریبان میں ہاتھ مارا۔ پیشتر اس سے کہ کوئی کانسٹیبل مدد کو پہنچتا۔ فضل قادر کی وردی پھٹ گئی اور پگڑی کلاہ سمیت فرشِ زمین پہ آ رہی۔ کانسٹیبلوں نے اُستاد کی بھی پٹائی کر دی۔ لیکن فضل قادر کو ضربِ کاری مدت العمر یاد رہی۔

فضل قادر چند دن میں تبدیل ہو گیا تو پھر وہی اُستاد کا ہوٹل اور چرس کی ٹکسال لگ گئی۔ رفتہ رفتہ اُستاد پر مذہب کا رنگ چڑھنے لگا۔ داڑھی بڑھالی۔ سُرخ ترکی ٹوپی سے چہرے کا رنگ

نکھر آیا۔ لیکن چرس کا دھندا اس سے نہیں چھوٹا۔ اپنی پاکیزہ آمدنی میں سے ایک پیسہ فی روپیہ کے حساب سے رقم پس انداز کرتا رہتا اور سہ ماہ اپنے جیسے ایک پیر کار یگہ سائیں بابا کو پیش کر دیتا جس نے گیارہویں شریف کے نام سے بھنڈارا کھول رکھا تھا۔ ایک روز میں نے پوچھا اُستاد حرام کی کمائی گیارہویں کے نام پہ دیتے ہو خدا کا خوف کرو۔ کہنے لگا بابو میرا تو روزگار ہی یہ ہے۔ میں کیا کروں۔ اس شخص سے پوچھو جو مجھ سے اس نام پہ دو اڑھائی سو روپیہ ماہانہ وصول کر کے دیگیں پکاتا اور قوالی کراتا ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ میں مالِ حرام اس کی نذر کرتا ہوں۔ جب اُسے ہی خوفِ خدا نہیں ہے تو میں سمجھتا ہوں شاید میری نیت کا خلوص شرفِ قبول پا جائے۔

مکھنا بدمعاش اور نہری پہلوان ہندو غنڈے تھے لیکن ان کی حیثیت اس سے بیش نہیں تھی کہ چھوٹے موٹے جھگڑوں میں کھڑپینچ بن کر کھڑے ہو جاتے۔ کوئی کارِ نمایاں اُن سے سرزد نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ مسلمان غنڈوں سے دب کر رہے اور کبھی مقابلے کی جرأت نہ کی۔ مسلمان غنڈے تھے تو غنڈے، لیکن اُن کی وجہ سے گلی کوچوں میں امن کی فضا قائم رہتی۔ وہ شرفا کی آبرو کے محافظ تھے اور بگڑے ہوئے خود سر چھوکروں کو بال سنوار کر کوچہ و برزن میں فحش گیت گانے اور معصوم لڑکیوں پر آوازے کسنے کی جسارت

نہ کرنے دیتے۔

مئی ۲۶ء کے فساد کی رات غنڈوں نے بڑا کام کیا۔ ساری رات کمربستہ کھڑے پہرا دیتے رہے۔ ہاکیاں اور ڈنڈے اُٹھا کر جامع مسجد کی حفاظت کی۔ میرا بادیہ اور گولڑہ شریف سے بھی امدادی پارٹیاں پہنچ گئیں۔ جامعہ مسجد ہی سے نصف شب کے وقت دو تین نوجوان تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے نکلے اور راجہ بازار کے گوردوارہ میں جہاں سکھوں نے مورچہ بندی کر رکھی تھی بے دھڑک گھس کر گیس چھوڑے اور جھٹکے سے باہر نکل گئے۔ روشنی گل ہو گئی۔ سکھوں نے سمجھا مسلمانوں نے منظم حملہ کیا ہے۔ کرپانیں نیام سے نکل آئیں اور آپس ہی میں چلنے لگیں۔ کچھ دیر میں جب جوش فرو ہوا اور روشنی کی گئی تو معلوم ہوا کہ واہ گورو کے دو درجن خالصے کٹے پڑے ہیں۔ صبحدم لاشوں سے بھرا ہوا چھکڑا لے کر گئے اور اٹک کی لہروں کے سپرد کر آئے۔

ایمان کی حرارت والے

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

مخلوط آبادی کی وجہ سے مسلمانوں میں اجتماعی تصور ہی سرے سے موجود نہ تھا۔ مسلمان مالی اعتبار سے بھی خوشحال نہ تھے اور ترقی کرنے کا جذبہ بھی اُن میں نہیں تھا۔ مقامی اور مضافات کے بیشتر لوگ مزدوری پر اکتفا کرتے۔ اکثر اُن میں سے دہقان زادے بھی ہوتے جو کھیتی باڑی سے فارغ ہو کر مشقت کی نیت سے شہر آ نکلتے۔ کبھی کبھی ایک دو نفر ایسے برآمد ہو جاتے جو تھوڑی بہت عقل سے کام لیتے اور مزدوری کے زُمرہ سے نکل کر سفید پوشی میں قدم رکھنے لگتے۔ ایسے ہی کسی سفید پوش سے پوچھو کہ کیا کرتا ہے۔ بڑے فخر سے بتاتا "ٹھیکیداری"

"کمیں ٹھیکیداری"

گدھے رکھے ہوئے ہیں مٹی ڈھوتا ہوں۔

مٹی ڈھونے والی ٹھیکیداری مزدوری کی ارتقائی شکل تھی۔ دوسری طرف ہندو اپنی محنت اور تدبّر سے چند ہی برس میں کاروبار کی ساکھ جما کر خوشحال ہو جاتے۔ کوئی موٹی توند والا ہندو گاڑی سے اترتا تو ریلوے سٹیشن پر دس بیس مسلمان قلی اس کا سامان اُٹھانے کے لیکتے اور آپس میں جھگڑتے۔ یہ قومی انحطاط کا انتہائی اندوہگیں زمانہ تھا۔

لیکن ہم اس صورتِ حال کو مالی بدحالی سے منسوب کر سکتے ہیں ویسے مسلمان کسی سے دب کر رہنے والی جنس نہ تھے۔ ہندو سکھوں کو "او سکھا۔ اوئے کراڑا" کے تحکمانہ لہجے میں خطاب کرتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوری ڈویژن میں ہندو اور سکھ غیر زراعت پیشہ تھے اور غیر زراعت پیشہ کو بالعموم "کمین" سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس کتنی ہی "ٹھیکریاں" سونے چاندی کی کیوں نہ ہوں۔ سکھوں کا اگرچہ اپنا عہد بھی گزرا لیکن ان کی بیشتر زمینداریاں ضلع ہزارہ میں تھیں۔ ہری پور کا قصبہ ہری سنگھ نلوہ نے آباد کیا تھا۔ وہاں سکھوں کی جاگیریں تھیں جو قیام پاکستان کے بعد جا کر ختم ہوئیں پوٹھوہار میں مسلمان پہلے بھی آسودہ حال نہ تھے۔ انگریز نے اپنے وقت میں انتقاماً انہیں آگے بڑھنے نہیں دیا اور تعلیم و تجارت

دونوں شعبوں میں کمزور رہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پوٹھوہار کو شمشیر گیروں کی زمین سمجھا جاتا۔ یہاں سے لڑنے مرنے والے سپاہی مہیا ہوتے۔ اگر یہ آسودہ حال ہو جاتے تو بیس روپے کی خاطر جان دینے والے بھمبے ذرا مشکل سے دستیاب ہوتے۔

لیکن مسلمان جیسے کچھ بھی تھے ہندو کو صید زبوں سمجھتے تھے سکھوں کے عہد میں گائے کا ذبیحہ بند رہا۔ لیکن تاج برطانیہ کے زیر سایہ بیف مارکیٹ کھل گئی تو مسلمانوں نے ہمت سے کام لیا اور گائے ذبح ہونے لگی۔ اس پر بھابھڑ خانے سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ عید قرباں کے ایام تھے مسلمانوں میں جوش پھیل گیا۔ خاص عید کے دن میاں قطب الدین مرحوم کی قیادت میں مسلمانوں نے دھوم دھڑلے کے ساتھ لابد بازار کے چوک میں گائے ذبح کر ڈالی اور ہندو سکھ دیکھتے رہ گئے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی ختم ہو گئی۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مسلمانوں میں جماعتی شعور نے کروٹ لی اور ایک مرکزی جامعہ مسجد کی تعمیر کا خیال آیا۔ شہر اور چھاؤنی کے علاقے میں یوں تو تقریباً کے قریب چھوٹی بڑی مسجدیں تھیں لیکن مرکزی جامعہ مسجد کی کمی بہت بڑی محرومی تھی۔ پرانے قلعہ پر میاں نبی بخش کی تعمیر کردہ ایک مسجد اب بھی موجود ہے۔ پہلے اسے جامعہ مسجد کہتے تھے لیکن اسے مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ آخر مسلمانوں نے مرکزی جامعہ کے لیے موجودہ جگہ حاصل کی

یہاں اُن دنوں
گہرا گڑھا تھا۔ برسات کے دنوں میں عقبی نالے کا پانی اُچھل کر گڑھے میں آگرتا اور تالاب کی شکل بن جاتی جس میں مچھروں کی بارا ماری ہونے لگتی گڑھے کے عقب میں ہندوؤں کا مندر تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کے متصل مسجد بنے۔ چنانچہ مخالفت شروع ہوگئی۔ آس پاس تمام جائداد سکھوں کی تھی۔ وہ بھی ہمنوا بن گئے۔ لیکن میاں قطب الدین اور میاں پنجا بخش دو مقتدر مسلمان شہر میں ایسے تھے۔ جنہیں ہندو تو کیا انگریز کی بھی پرواہ نہ تھی۔ اُنہوں نے تعمیر مسجد پر کمر باندھی، اینٹیں اور مسالہ جمع کرنے کے بعد محمد ایوب سابق شاہِ افغانستان سے (جو اُن بہ صیغۂ نظر بندی پنڈی میں موجود تھے) مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی التجا کی جسے سابق شاہ نے شرفِ پذیرائی بخشا۔

مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ بنیادیں —— اُٹھانے کے بعد گڑھے کو جو نو فٹ گہرا تھا برابر کیا گیا۔ یہ ۱۹۰۲ء کا واقعہ ہے۔ اس لمحہ سے جماعتی شعور اور یک جہتی کا احساس یکا یک بیدار ہوا اور مسجد کی تعمیر شروع ہوگئی —— مسجد کی تعمیر کے لئے چندہ کی فراہمی انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ تعمیر کمیٹی تشکیل ہوئی۔ قاضی سراج الدین بیرسٹر مرحوم اور دوسرے اکابرینِ شہر کی کوششوں سے پنجاب گیر پیمانے پر اپیل ہوئی اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا۔ پشاور کے کریم بخش سیٹھی مرحوم نے ایک لاکھ روپیہ تعمیر فنڈ میں دیا۔ کہتے ہیں۔ یہ رقم صرف برآمدہ

کی تعمیر میں صرف ہوتی۔ جس کمرہ میں آجکل اوقاف کا دفتر ہے۔ یہ کریم بخش سیٹھی مرحوم کی رہائش کے لیے مخصوص رہا۔ وہ کبھی پنڈی آتے تو اسی کمرہ میں فروکش ہوتے۔

لیکن نادار مسلمانوں کے اس شہر میں جس جوش و خروش سے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں نے مسجد کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ وہ قومی تاریخ کا درخشاں باب اور ملّی احساس کی معراج ہے۔ جگہ جگہ سربمہر صندوق رکھوائے گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنا جیب خرچ ان میں ڈال دیتے مستورات چھلّے انگوٹھیاں چپکے سے چھوڑ دیتیں۔ مزدور پیشہ افراد اپنی قلیل آمدنی کا ایک حصہ تعمیر فنڈ کی نذر کرتے۔ جمعرات کو تعمیر کمیٹی کے دفتر میں ہر گھر سے آٹے کی ایک ایک تھالی آتی۔ سُنا ہے مضافات کے لوگ لکڑیاں اور اوپلے لاد کر لاتے اور تعمیر فنڈ میں جمع کرا جاتے۔ رات کے وقت پردہ نشیں خواتین تعمیر میں اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کے لیئے آئیں۔

موضع قاضیاں تحصیل گوجرخان کے ایک ریٹائرڈ تحصیلدار قاضی گوہر دین مرحوم مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ صابح سویرے دو تین رضا کاروں کو لے کر نکلتے شہر اور صدر کے علاقے میں مسلمانوں کے گھروں پر دستک دیتے اور غیرت دلا دلا کر چندہ اُگھراتے۔ آٹا اکھٹا کرتے۔

اہلِ فن معماروں میں عبدالعزیز فطرت مرحوم کے والد جناب غلام نبی کامل

بھی شامل تھے۔ یہ مسجد صنعتِ تعمیر کا دلکش نمونہ ہے۔ دیواروں اور محرابوں پر حسین و جمیل نقش و نگار کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ پورے برصغیر کی کسی شاہی مسجد میں بھی تزئین کا یہ انداز دیکھنے میں نہیں آیا۔

۱۹۰۵ء کو تعمیر مکمل ہوئی۔ انجم رضوانی اور افضل پرویز کے والد مرحوم مولانا محمد یحییٰ مکرانی اولین خطیب مقرر ہوئے۔ ویسے افتتاحی جمعہ مولانا سید محمود شاہ صاحب رحمۃ نے پڑھایا جو موہنج ڈھینڈا کے صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ افتتاح کے روز حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ سابق شاہ افغانستان بھی تشریف لائے۔ سابق شاہ جب تک پنڈی میں رہے یہیں جمعہ ادا کرتے۔

قیامِ پاکستان تک سیاسی اقتصادی اور معاشرتی مسائل طے کرنے کے لئے ہر طبقہ و خیال کے علماء اس مرکز میں تشریف لایا کرتے۔ میرے اللہ وہ کیسے کیسے لوگ تھے جو یہاں آتے۔ مولانا انور شاہ کاشمیری نے یہاں خطاب فرمایا۔ مولانا ظفر علی خاں کی آتش نوائی سے دل گرمائے اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کے زورِ خطابت کے زمزمے صحنِ مسجد سے ابھرے اور فضا میں گونجے اور ان کی کوثر میں دھلی ہوئی حجازی قرأت کی لے سے دیوار و در وجد میں آئے ؎

مری حبِ رسول اللہ کی بنیاد ہے مسجد
خدا آباد رکھے آج بھی آباد ہے مسجد

جہاں انگریز نے چھاؤنی ڈالی

زمانہ گزرتا ہے موجودہ جنرل پوسٹ آفس سے لے کر سپورٹس سٹیڈیم تک کے رقبہ میں ایک گاؤں غزنی پور کے نام سے آباد تھا.

۱۰۰۰ء کے لگ بھگ سلطان محمود غزنوی کے مجاہد لشکریوں کو اس مقام پر اچانک پڑاؤ کرنا پڑا۔ کیونکہ سلطان خود مزید کمک مہیا کرنے کے لیئے واپس چلا گیا تھا. بہت دنوں جنگل میں منگل کا سماں رہا اور جب محمود غزنوی تازہ سپاہ کے ساتھ آ کر آگے بڑھ گیا تو اس جگہ ایک گاؤں آباد ہو گیا جسے غزنی پور کہنے لگے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں کی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پہلے ایک گکھڑ سردار جھنڈے خان نے مرکز سے بغاوت کر کے جہلم اور سندھ کے درمیانی علاقے پر تسلط جمایا.

جھنڈے خان ہی نے غزنی پور کو راولپنڈی کا نام دیا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں ایک سکھ لیڈر سردار ملکھا سنگھ نے پوٹھوہار پر قبضہ کر لیا۔ (مولانا ظفر علی خان نے اپنے ہفت روزہ اخبار "صبح کا ستارہ" میں ملکھا سنگھ کو ملک سنگھ لکھا ہے)

۱۸۰۰ء میں ملکھا سنگھ نے غزنی پور میں ہی اپنا فوجی مرکز کھولا تھا۔ بالآخر ۱۸۴۹ء کے بعد انگریز کے عہد میں غزنی پور پھیل کر پنڈی چھاؤنی بن گیا۔ ابتدا اگرچہ مختصر تھی۔ مگر ہوتے ہوتے اتنی وسعت ہو گئی کہ اس نے متحدہ ہندوستان کی سب سے بڑی چھاؤنی کا نام پایا۔ گویا یہ چھاؤنی سب پر چھا گئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب علاقائی اہمیت نے پنڈی کی قدر و قیمت بڑھا دی اور فرنگی نے فوجی اڈے قائم کیے تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہر قماش اور مزاج کے لوگ آئے جن میں پوربی ہندو۔ اگروال بنیئے۔ شیخ بوہرے تاجر اور بنگالی بابو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان عناصر کی آمیزش سے چھاؤنی کی بستی بنتی چلی گئی جس کا الگ تمدن، خاص بولی ٹھولی اور جداگانہ معاشرہ تھا۔ اس معاشرت میں رنگا رنگی، دلآویزی اور زندگی کی رونق تھی۔ یہ لوگ رزق کی تلاش میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

تصور کی مدد سے دیکھیے ۱۸۳۰ء کا زمانہ ہے۔ چھاؤنی معرکہ

وجود کا حصہ نہیں ہیں۔ غزنی پور کی مختصر دیہاتی بستی کو چھوڑ کر موجودہ ریلوے روڈ کے رُخ پر نالہ لئی کے کنارے ایک سرائے اور اس کے ساتھ چند چھوٹی چھوٹی دکانیں اور مکان تھے۔ انسان کا ذوقِ جمالِ مناظر کی آغوش میں مستقر بناتا ہے شاید آب رُکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ والی حکایت ہے۔

دکانوں اور مکانوں کا یہ سلسلہ سکھوں کے عہد حکومت تک میسی گیٹ کی سمت بڑھتا رہا۔ درمیان میں ہاتھی چوک سے مدرسہ فاطمیہ تک ایک باغ تھا جسے بدری باغ کہتے تھے۔ ۱۸۴۰ء کی ایک صبح تھی کہ سکھ لٹیروں کا جتھہ دفعتہً خلا سے نمودار ہوا اور آن کی آن میں دکانوں مکانوں کی رونق لوٹ کر لے گیا۔ مکان اگرچہ مکینوں سے خالی نہ ہو سکے پر دکانیں قیامِ پاکستان تک یہاں نہیں بنیں۔

۱۸۸۰ء میں جب ریل گاڑی آئی تو اسی کھنڈر پر لوہے کی پٹڑیاں بچھ گئیں۔ سیڑھیوں کا پل بنا اور برابر ایک سڑک نکلی جو ریلوے سٹیشن تک چلی گئی۔ اس سڑک کے بائیں ہاتھ نانبائیوں کے تھڑے۔ موچیوں کی بیٹھکیں۔ چپلی کباب والوں کے چولہے اور گراموفون ریکارڈوں والے غلیظ ہوٹل بن گئے۔ یہ صورت جہاں تہاں آج بھی موجود ہے۔

موجودہ صدر بازار کی رونق اور آبادی بہت بعد کی بات ہے

ریل گاڑی آچکی۔ سٹیشن کھل گیا۔ پھر بھی سڑک پر سنسانی طاری تھی کہیں کہیں کوئی ٹُل ٹُل گباڑی یا ایک آدھ یکہ لڑکھڑاتا نظر آجاتا۔ محصول چنگی کی بغل میں کچھ کچے چھپرا اور چوہڑے چماروں کے گھروندے تھے۔ اس ہیولے سے نئی تعمیر کی منصوبہ بندی ہونے والی تھی۔

چھاؤنی کے سٹیشن کمانڈر نے سفید زمینیں بانٹنا شروع کیں۔ اب یہ دُور اندیشوں کا مقدر تھا کہ جس قدر چاہیں زمین قبضا لیں۔ اس شاہی تقسیم میں بیدار مغز ہندو سکھوں کے علاوہ بوہروں اور کم کم شیخ برادری کے معاملہ فہم بزرگوں نے ساقی کی نگاہیں بھانپ کر اس کے دستِ کرم سے اتنا کچھ پا لیا کہ آنے والی ایک صدی کے لئے اجارہ داری قائم کر لی۔

باقی مسلمانوں کی قسمت میں چند ٹوٹی پھوٹی دکانیں آئیں۔ کباب اور شیر فروشی دو بڑے کاروبار تھے جو عام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے کہیں کہیں لوہار، ترکھان اور درزی تھے۔ لیکن ان کا شمار اہل حرفہ میں کیجئے۔ یہ تمام لوگ لشتم پشتم وقت کو دھکے لگاتے رہے۔ دو تین بدنام دکانیں مسلمان کریانہ فروشوں کی تھیں جو مہنگ فروشی کی وجہ سے ہندوؤں کے مقابلے میں صفر کے برابر تھیں۔ البتہ سوئی بٹوئی اور بساطی والوں کے دو چار آسودہ گھرانے ضرور تھے۔ باقی سارا لین دین بیوپار اگروال بنیوں اور جینیوں کے قبضے میں تھا۔ تھوک پرچون کا کاروبار بھی ان کے ہاتھ میں تھا اور گنگ منڈی پراچ کا پورا

قبضہ تھا۔ جگہ جگہ ان کے مندر۔ آشرم اور دھرم سالے کھل گئے تھے
حتیٰ کہ ڈولا تبر یرماہی بھی اُن کے جماعتی خرچ پر چلتی تھیں۔ بیوپار
چونکہ اُن کے قبضہ اختیار میں تھا اس لیے گلشن کی ساری بہار
اُن کے دم سے تھی۔

کنک منڈی ہی اُن کے سیاسی اور مذہبی ہنگاموں کا مستقل
اڈا تھا۔ جلسے ہوتے اور یہیں سے نگر کیرتنوں کا آغاز ہوا کرتا۔ یہیں
دوسہرہ کے دنوں میں رام لیلا رچائی جاتی۔

عام ہندو بہ صفت موصوف ہندو تھے۔ اُنہیں بظاہر مسلمانوں
کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے دیکھا جاتا لیکن گُن گانٹھ کے پورے تھے
دن کی بنیا چال سے خدا کی پناہ۔ ایسی ڈنڈی مارتے کہ کئی متوسط
حال گھرانے پہلے رہن اور پھر دیکھتے دیکھتے نیلام ہو گئے۔ اُن کے
سُود در سُود کا چکر تھا یا ریوڑی کا پھیر —— ایسا مکڑی جال جس
میں پھنس کر نکلنا ممکن نہ تھا۔

لیکن سابقت کی دوڑ میں سُست گامی کے باوجود چھاؤنی کے
مسلمان زندہ دل تھے روایتی مست مولائی کے باوجود اُن میں روح
حیات برابر انگڑائیاں لیتی نظر آتی۔ کوچہ قصاباں، محلہ نوری سوجی۔
تکیہ فضل حق۔ بھوسہ منڈی۔ احاطہ مٹھو خاں اور احاطہ فضل الٰہی
مسلمانوں کے مشہور محلے تھے۔ ان میں رہنے والے بیشتر مسلمان عقائد
اور رسومات کے لحاظ سے کم و بیش یک رنگ تھے۔ اس یگانگت

کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ ایسی یکسانیت کسی اور قرینے میں مشکل سے ملے گی۔

کوچہ قصاباں اور گلی نوری سوجی دو جڑواں محلے ہیں۔ یہاں بیشتر آگرہ اور میرٹھ کے مسلمان آباد ہوئے۔ شیخ نوری میرٹھ کا پانڈی تھا۔ اس نے یہاں آکر چینی سوجی اور میدے کی دوکان کھولی۔ رفتہ رفتہ اس کے عزیز و اقارب بھی آگئے اور مل جل کر ایک ہی کنبے نے اس گلی کو بسالیا۔ نوری سوجی اسی رعایت سے اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

کوچہ قصاباں کی تشکیل بھی کچھ اسی ڈھب سے ہوئی اور یہ دونوں محلے شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔ کیونکہ یہ سب کے سب عقیدے والے تھے۔ نذر نیاز اور عید شبرات پر پیمان کا پختہ ایمان تھا۔

شیخ نوری بڑا باغ و بہار آدمی تھا۔ اس نے پوربی گھسیاروں کو گرہ میں باندھ رکھا تھا۔ یہ گھسیارے تھے تو ہندو لیکن کسی حضرت صدوح کے بڑے معتقد تھے اور ان حضرت کے نام کا بکرا شیخ نوری کے استھان پر چڑھانے کے لئے لایا کرتے۔ شیخ نے عجیب طلسم باندھ رکھا تھا۔ اپنی دکان کے عقبی کمرے میں اس نے ایک چوکی خاص حضرت صدوح کے نام کی لگا رکھی تھی۔ جب کوئی گھسیارا اپنی منذر کا بکرا لاتا تو شیخ نوری پہلے اس بکرے کو مخصوص چوکی پر

چڑھانے کے لئے عقبی کمرے میں لے جاکر کمرے کے کواڑ بند کر دیتا چند لمحوں کے بعد جب بکرا برآمد کیا جاتا تو اس کی کیفیت ہی اور ہوتی۔ اپنے سر کو مسلسل اُوپر نیچے حرکت دیتا۔ یہ کیفیت اثبات غماز ہوتی کہ حضرت ممدوح نے قبول فرمایا۔ گھسیارے بیچارے اس ادا پہ قربان ہو ہو جاتے —— بعد مدت کے یہ پاکھنڈ کھلا کہ نوری شیخ بکرے کو اندر لے جاکر اس کے جباڑے کھول کر تالو کے ساتھ سیاہی چوس کا ٹکڑا چپکا دیتے ہیں۔ بکرا اس خارجی جنس کی وجہ سے سر کو اُوپر نیچے اضطراری حرکت دینے لگتا ہے۔ اس دل لگی کی بدولت شیخ نوری خاصہ متمول آدمی بن گیا اور اس کا گھر مستقل بکرا منڈی نظر آیا کرتا۔

اس زمانے میں بکرے بہت سستے تھے۔ گوشت بھی ارزاں تھا۔ دو آنے سیر یا دھیلا پیسہ اُوپر۔ مگر کھال چار پانچ روپے میں اُٹھتی تھی۔ جس سے قصابوں نے خوب دولت پیدا کرلی یہاں تک کہ عورتوں کی طرح گہنا پاتا پہنتے تھے۔ رفتہ رفتہ روپے کی بھرمار سے خدا کی مار نازل ہونے لگی۔ بہت سے قصائی بھائی عیش و نشاط اور رامش و رنگ میں لگ گئے اور ہوتے ہوتے گھڑ دوڑ میں اُن کی خاک اُڑ گئی —— اگرچہ ماضی قریب تک بیاہ شادی کے موقعہ پر طاشے اور طوائفوں کی دھوم میں براتیں جاری تھیں مگر سدا بادشاہی خدا کی ہے آج ۲ یک آدھ قصاب

بیچے کے سوا مٹن مارکیٹ کے اندر پرانے بزرگوں میں سے کوئی باقی نہیں۔ نئی پود نے تنگ آکر آبائی پیشہ کی جگہ تکے کباب اور پان سگریٹ کی دکانیں کھول لی ہیں۔

اسی طرح نوری سوجی والوں کا بھر پور کنبہ حالات کی گردش دولابی میں پس کر رہ گیا لیکن ان دونوں محلوں میں ایک روایت وابستہ تھی۔ اس کی یادگار آج بھی قائم ہے اور وہ عید میلاد کے جلسے کا انعقاد ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ جو ربیع الاول کے دنوں میں گزشتہ پون صدی سے برابر جاری ہے ـــــ مگر ایک چیز جو بن کر مٹ گئی وہ محرم الحرام کی بابرکت تقریبات تھیں۔ شربت کی بارونق سبیلیں۔ پلاؤ کی دیگیں۔ کھچڑے کا پکوان بھولی بسری داستان ہو گئے۔

اک طرف یہ تقریبات تھیں۔ دوسری جانب چک بازار کی مسجد اہلِ حدیث کے محراب و منبر سے میلاد شریف اور محرم کی نذر و نیاز کو بدعت قرار دیا جاتا۔ لیکن خدا کی شان ہے نہ یہ کام رکا۔ نہ وہ تبلیغ ہی بند ہوئی۔ اتفاق کی بات یہ کہ ورثائے بہشت بریں کی مسجد کا ایک دروازہ نوری سوجی گلی میں بھی کھلتا تھا۔ ادھر نوری سوجی والے عید شبرات مناتے ڈومنیاں اور قوال سُر تال لگاتے۔ ادھر سنت کا غلبہ تبلیغ کا زور۔ آگ اور پانی کے دھارے مدتوں ساتھ بہتے رہے۔

نصیبن ڈومنی کے رت جگے کی محفلیں میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھی ہیں۔ خاصی کلّے ٹھلّے والی بی بی تھی۔ اس کی بڑھیا ماں ڈھولک پیٹتی۔ پان پہ پان چڑھاتی اور نصیبن بی گھنگھروؤں کے چھناکوں کے درمیان ناچتی گاتی۔ طلوعِ فجر تک یہ ہنگامہ رہتا

چک بازار پر بھی توحید کی یبوست کا کسی قدر وجدانی اثر نمایاں تھا۔ لیکن چک سازوں کی خوش باش اور زندہ دل بستی چھاؤنی بھر میں بس ایک تھی۔ چوسر کی بازیاں اور تاش اس بازار کا روز مرہ تھے۔ طویل اور بلند قہقہے۔ پھبتیاں۔ ضلع جگت۔ سوانگ بھرنا اور راہ گیروں کا منہ چڑانا اس بازار کی معمولی خرمستیاں تھیں۔ لوگ بالعموم اس بازار سے گزرنے کی جگہ قبرستان کا پھیرا کر آنے کو ترجیح دیتے۔ سخت گرمی کے ایام میں یہاں غریب مزدوروں کے سر پہ گوبر بھرے گھڑے پھوڑے جاتے تھے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے اور منہ کالا کرتے۔ بارش برسانے کا یہ خاص الخاص مجرب نسخہ تھا۔ جس دن بھی یہ افعالِ شنیعہ کیے جاتے۔ کالی گھٹائیں امڈ کر آتیں اور چھاجوں مینہ برستا۔

ان چک سازوں میں ایک مغل شاہزادہ بھی آن بسا تھا۔ مدت العمر چکیں بُنتا اور جھاڑو باندھتا رہا۔ لال قلعے کے اس وارث کو چلمن گری کے ہنگام پائے تمکس اور تارِ نفس کی تیلیاں ضرور یاد آتی ہونگی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ مغلئی ناک نقشے اور گورے چٹّے

والے اس شاہزادے کو شعروشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ اپنے اندرون میں ہر وقت گنگناتا شاید اُستاد ذوق کا یہ قصیدہ پڑھتا ہوگا ؎

گرچہ قندیلِ سُخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوُا
ڈھانچ ہیں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

کنٹونمنٹ ہسپتال کے بالمقابل دھنجی بھائی کے تانگوں کا اڈّا تھا۔ یہاں سے کوہ مری اور کشمیر کے لئے تانگے چلا کرتے۔ چوروں ڈاکوؤں کے ڈر سے دو تین تانگوں کا قافلہ نکلا کرتا۔ روانگی کے وقت بگل بجائے جاتے۔

کنٹونمنٹ ایکٹ مجریہ ۱۹۲۴ء کے بعد چھاؤنی کی زندگی میں ایک اور دلچسپی کا آغاز ہوا اور وہ الیکشن کا ہنگامہ تھا جو ہر تیسرے سال بپا ہوتا۔ انتخابات کی یہ رُت بہار سے کم نہ ہوتی۔ توڑ جوڑ اور تفریح کی بھیڑ لگ جاتی۔ مخلوط انتخابات کی وجہ سے ہندو مسلم سوال شدت اختیار کر لیتا۔ اُمیدواروں کی حامی ٹولیاں بڑے بڑے بازاروں میں گشت کے لئے نکلتیں۔ ہرنا کے اور چوک میں تقریریں ہوتیں۔ محمد رمضان کلاچی کی بجتی ہوئی آواز دُور دُور تک گونجتی۔ غلام حسین ہوٹل والے نے تحت اللفظ پڑھنے میں ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ جلوس گرما جاتا اور پے بہ پے تحاشہ نعرے لگتے ٹیپ کے ہر بند پر وہ "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ اس زور

سے لگاتا کہ ہندو کا کلیجہ دھڑک اُٹھتا اور مسلمانوں کو بھی یہ باور آجاتا کہ الیکشن کی وجہ سے اسلام واقعی خطرے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خطرہ چند روزہ گرما گرمی کے بعد خود بخود ٹل جاتا۔ ہندو نوٹ دے کر ووٹ خریدتے اور بورڈ کے ممبر بن جایا کرتے۔

بورڈ کے بیشتر ملازمین اور افسر ہندو تھے۔ اُن سے گٹھ جوڑ کے بعد ہندو ممبروں کے رشتہ دار اور احباب اپنے لئے آسائش کے جملہ سامان بہم پہنچا لیتے۔ بورڈ کے کارندے۔ انجینئر اور رینڈ سپرنٹنڈنٹ کھلے بندوں رشوت کھاتے اور دندناتے۔ اُنہوں نے موٹر گاڑیاں رکھی ہوئی تھیں اور گوالمنڈی میں کئی کارخانے بھی کھول لئے تھے۔ ایک سکھ بابو منتا سنگھ جو بورڈ کا سکرٹری تھا رشوت کے سبب ملازمت سے نکالا بھی گیا۔ لیکن بدعنوانیوں کا خاتمہ ہوا نہ ہوگا۔ فافہم اِنّہٗ من الاسرار

؎ درِ فیضِ حق بند جب تھا، نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ

سات ٹاٹ

چند محنت کش طبقوں کے ذکر سے میں "چھاؤنی کی کہانی" کو آگے بڑھا رہا ہوں۔ کیونکہ یہی مزدور پیشہ لوگ تھے جن کے وجود سے چھاؤنی کے رگ و پے میں زندگی کی حرارت رواں دواں تھی۔ بلکہ اُنہی کی سُرخی زیبِ عنواں تھی۔ اگر اُنہیں بزم سے نکال دیں تو میسی گیٹ کے آس پاس پان وس خوک و خمر بیچنے والی دکانوں۔ چند بنگلوں اور "کلف گھر" کے سوا یہاں دھرا ہی کیا تھا۔

یہ لوگ اکا دُکا آئے مگر جلد ہی مختلف برادریوں کی شکل میں اکٹھے ہو گئے۔ یُونہی قطرہ قطرہ دریا اور دانہ دانہ انبار بن جاتا ہے۔ ان محنت کش افراد کے چند نمایاں گروہ تھے۔ یعنی سقے۔ بہشتی بیرے خانساماں۔ آبدار۔ نائی۔ مشعل بردار۔ بارہ گیر اور خدمتگار۔

بظاہر ان کی جمعیت بکھری بکھری نظر آئے گی کیونکہ پیشہ ورانہ ضرورتوں کے لحاظ سے یہ طبقے لال کرتی۔ توپ خانہ بازار۔ ویسٹرج اور صدر کے مختلف حصوں میں آباد تھے۔ مگر اصل میں یہ سب ایک تھے۔ دل و جان سے ایک ــــ یہ زندگی کی موجودہ گرم بازاری سے پہلے کا واقعہ ہے ابھی ہوائے تند و تیز نے فرد اور اجتماع کی خاک اڑائی نہ تھی۔ کیونکہ انفرادی ردیوں کے لئے اجتماعی قحط بپا کرنے والے لیڈر ابھی پیدا نہ ہوتے تھے۔ ابن آدم محنت اور مشقت کے بل پر شاہراہ حیات کے اُوپر دھیرے دھیرے چلا جاتا تھا۔ زندگی کی لوحِ جبیں پر طلوعِ سحر کے ساتھ ہی روشنی کی چھوٹ پڑتی اور شکن در شکن پیشانیوں پر مزدوری کا پسینہ جھلکنے لگتا۔ مگر غروب کے ہنگام چراغوں کی مدہم مدہم ضیا معصوم اُمنگوں کو بیدار کر کے اپنے دوش پر اُٹھا لاتی اور تنگ و تاریک حجروں میں زندگی رنگا رنگ دلچسپیوں کے ورق اُلٹا کر رکھ دیتی۔ درمیان میں حقہ گردش کرتا اور گرداگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہنستے چہکتے خوش ہوتے۔ بڑے بوڑھے پرانی داستانیں دہراتے۔ مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ اور عظمتِ گزراں کی پرچھایاں تصور کے پردوں پر اُبھر آتیں۔ سن ستاون کی بپتا اور نئے دور کا ہنگامہ ــــ یہی کچھ موضوع تھے جن کے محور پر سال خوردہ بزرگوں کا حافظہ گھومتا ــــ شاید ماضی میں کوئی بات تھی جو حال میں نہیں۔ جبھی

تو ذہن صدیوں کی مسافت کو پھلانگ کر عہدِ کہن کی پہنائیوں میں جا پہنچتا ہے۔ بزرگ جب ان داستانوں کو دہراتے دہراتے تھک جاتے تو جوانوں کے نغمے کا آغاز ہوتا۔ کٹورے بجنے لگتے۔ برہا کی آگ کا لاوا راگ کے سیلاب میں بہنے لگتا۔ فضا میں یہ صدا اُبھرتی اور ڈوب جاتی ؎

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے اور کچھ نہ زباں سے کام لیا
رات بھیگنے لگتی اور پلکیں بھی۔ فضا کی سنسان تاریکی میں کوئی مہجور دل کی بات سناتا اور سُننے والوں کے تیور کہہ رہے ہوتے ؎ مگر یہ داستاں ہے سارے زمانے کی۔

اس نوعیت کی مجلسی سرگرمیاں ان برادریوں میں قدیم سے جاری تھیں اور آج بھی کم وبیش موجود ہیں۔ خاص طور پر ذکر کے قابل وہ اجتماعی معاشرتی تصور ہے جو بڑی شدت کے ساتھ کارفرما تھا اور اسی سے اُن کے جماعتی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ فرنگی آکر جا بھی چکا مگر یہ لوگ اپنے مرکز سے نہیں ہٹے۔ ملک گیر پیمانے پر آندھیاں بھی آتی رہیں اور درختوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا مگر نرم و نازک پودے بدستور قائم ہیں۔ صحنِ بستان میں مالی کی رکھوالی کے باوصف پھول جھلس جاتے ہیں۔ لیکن صرصر کے طوفانوں اور بگولوں کی یورشیں صحرا کے نخلستانوں کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتیں۔

جن برادریوں کا اُوپر ذکر کیا گیا۔ اُن میں سے ہر ایک کی جماعتی

تنظیم شروع ہی سے قائم تھی۔ ان تنظیموں کا عرفی نام "ٹاٹ" تھا پھر ان کو ملا کر ایک مرکزی ٹاٹ بنا جس کا سربراہ "صدرِ امین" کہلاتا تھا۔ یہ منصب شیخ فضیل الٰہی مرحوم کے پاس مدت العمر رہا۔

ذیلی اور انفرادی تنظیموں میں سردار[1] صدر[2] اور صدر الصدور[3] ہوا کرتے۔ برادری کے روزمرہ عمومی معاملات کا فیصلہ انہی کی نگرانی میں ہو جاتا۔ پشاور روڈ کی "تکیہ" نامی کوٹھی کے احاطے میں ان کے اجلاس ہوا کرتے۔ جو شخص "ٹاٹ" سے رجوع کرتا اُسے گڑ کی چائے اور حقّہ کا انتظام کرنا پڑتا۔ ٹاٹ کے تمام رکن جمع ہوتے۔ سردار یا صدر دعویٰ کے کوائف سُنتا اور ملزم سے جواب طلبی ہوتی۔ کھڑے کھڑے فیصلہ سنا دیا جاتا۔ یہ فیصلہ اکثر حالات میں آخری اور قطعی سمجھا جاتا لیکن بعض سنگین نوعیت کے مقدمے صدرِ امین کی عدالت میں بھی لے جائے جاتے لیکن یہ ہر شخص کے بس میں نہ تھا کہ "صدرِ امین" کا اجلاس بلوائے۔ کیونکہ اس صورت میں مدعی کو نو روپے ادا کرنا پڑتے۔ گڑ کی جگہ چینی کی چائے چلتی اور پان تمباکو بھی اڑایا جاتا۔

صدرِ امین کا اجلاس باضابطہ صورت میں ہوتا۔ سب لوگ خاموش بیٹھ جاتے۔ مقدمے کے کوائف از سرِ نو دہرائے جاتے ملزم جواب دہی کے بعد "صدرِ امین" کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ صدرِ امین کو پانصد روپیہ تک جرمانے کی سزا دینے کا اختیار تھا۔ اب اگر مجرم کی مالی استطاعت اتنی نہ ہوتی کہ جرمانے کی رقم ادا کر سکے

تو وہ اپنی دستار کے پیچ میں حسب مقدور نقدی باندھ کر صدر امین کے آگے ڈال دیتا اور خود ہاتھ جوڑ کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کہتا ــــ "صاحب جو کچھ موجود تھا حاضر ہے"ــــ صدر امین گرہ کھول کر نقدی گن لیتا یا تو قبولیت کا اعلان ہو جاتا یا دستار واپس کر دیتا کہ جرمانے میں کمی و بیشی ممکن نہیں۔ مجرم پوری رقم ادا کرے یا برادری میں حقہ پانی بند ــــ!

سوشل بائیکاٹ کی یہ سزا ان برادریوں میں انتہائی چیز تھی جس کو آسانی کے ساتھ کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہ ہوتا کبھی سزا یافتہ مجرم اپنے اہل و عیال کو لے کر مدعی کے گھر پہنچ جاتا اور اپنی ٹوپی یا پگڑی اس کی دہلیز پر ڈال کر خود ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ ذلت کے اس مظاہرہ کے بعد فریق ثانی کی رگِ اخوت پھڑک گئی اور وہ اسے گلے سے لگا لیتا۔

ایک مرتبہ کسی سقہ نے دوسرے کو باتوں میں "ڈیم فول" کہہ دیا۔ اس نے "ٹاٹ" طلب کیا اور الزام لگایا کہ اس نے اپنی زبان میں کس بابت گالی نہیں دی یعنی ؎

ہمیں نرگس کا دستہ غیر کے ہاتھوں سے کیوں بھیجا
اگر آنکھیں دکھانا تھیں دکھاتے اپنی آنکھوں سے

ٹاٹ کے صدر نے مجرم کو قرار واقعی جرمانے کی سزا سنائی اور برادری میں چائے پانی کا جشن منایا گیا۔

عیدین اور شبرات کے موقعہ پر یہ رسم تھی کہ برادری والے اپنے اپنے "سردار" کے یہاں جاتے اور اس کی دستار بندی کرتے اور اس اعزاز بخشی کے صلہ میں وہاں مہمانی کھاتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عید ملاپ پارٹی ہوتی جس کے اخراجات "سردار" کو برداشت کرنا پڑتے۔

سقہ برادری میں جب کوئی بچہ کمر باندھتا اور اپنے پیشے کا آغاز کرتا تو اس کے گھر والے ساری برادری کی دعوت کرتے۔ اس موقع کو بڑا بابرکت خیال کیا جاتا کیونکہ سقوں میں مزدوری سے خیال سے نہیں بلکہ مخلوقِ خدا کو پانی ایسی نعمت پہنچانے پر غیر معمولی فخر و امتیاز کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے سقے اپنے تئیں بہشتی کہلواتے ہیں۔

ٹھاٹ باٹ کے لحاظ سے بیرے خانساموں کا "ٹھاٹ" سب سے بلند و بالا تھا کیونکہ اس فرقے کو انگریز بہادر کے مزاج میں خاصہ دخل تھا۔ تنخواہیں اگرچہ کم بھی ہوں تاہم "اوپر سے" "خدا کا فضل" بہت رہتا۔ ہر خانِ ساماں اپنی اپنی قلمرو کا خانِ اعظم سمجھا جاتا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انگریز بہادر کو اگر کسی نے اُلّو بنایا تو صرف یہی طائفہ تھا۔

اللہ ہُو۔ اللہ ہُو

پنڈی میں ایک پورا دَور مشاہیر علماء اور صوفیائے کرام کا ایسا بھی گزرا ہے کہ اس کی نظیر پنجاب بھر میں مشکل سے ملے گی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۳۶ء میں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر یہ دَور تمام ہوا۔ ان کی ذات میں تصوّف اور علوم عقلی و نقلی جمع ہو گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ طبعیات میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ اُن کے بعد اس سرزمین کو اتنا بڑا عالم پھر نصیب نہ ہوا۔

اُنھوں نے رُوحانی درس کا باضابطہ سلسلہ قائم کیا اور اس سرچشمۂ فیضان سے کتنے ہی لوگ سیراب ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی اور سید عطا اللہ شاہ بخاری مرحوم جیسے نامور اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے "آپ بیتی" میں حضرت سے

بیعت کا واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی کسی مسئلہ کی وضاحت کے لیئے رجوع کیا تھا۔ یہ خط و کتابت بھی شائع ہو چکی ہے۔

علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد حضرت پیر صاحب نے جب گولڑہ میں قیام کیا تو اس وقت ان کے شباب کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی۔ الحاقی مباحث اور موضوعی مسائل پر اجتہادی نظر رکھتے تھے۔ عقائد اور بالخصوص تصوف کے معاملے میں حکیم عبدالاحد خانپوریؒ سے اُن کا اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ جوابی تحریروں کا سلسلہ شروع ہوا جو بڑھتے بڑھتے افسوسناک رُخ اختیار کر گیا۔ چند تماش بینوں کی شوخیٔ نفس کے باعث یہ خالص مذہبی معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ نتیجہ تو بہر کیف ناگوار تلخی کے سوا کچھ نہ نکلا تاہم اپنے دور کے دو بے مثال عالموں کی ٹکر میں علمی کمالات کا اظہار جانبین سے تحریری شکل میں ہوا اور ضخیم کتابیں وجود میں آ گئیں۔ اب کسی کے پاس وقت ہو تو ان کا مطالعہ کرے اور علمی استدلال کی جولانیاں دیکھے۔

حکیم عبدالاحد خانپوری رحمۃ اللہ علیہ عامل بالحدیث تھے طب کے علاوہ حدیث اور تفسیر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ محمد ایوب شاہ افغانستان کے شاہی طبیب تھے اور انہی کے ساتھ نظر بند ہو کر پنڈی آئے۔ چند سے بعد نظر بندی ختم ہو گئی اور انہوں نے جامعہ اہل حدیث

کے ایک بوسیدہ حجرہ میں مطب کھول لیا۔ اسی شکستہ حجرہ میں انہوں نے اِک طرف معرکہ آرا معالجات کے باعث شہرت پائی تو دوسری طرف علمی کمالات کی دھاک بٹھائی۔ ۲۷ء میں حج سے واپسی پر انتقال ہوا۔ ان کی رحلت کی خبر گولڑہ شریف پہنچی تو اُس وقت حضرت پیر صاحب چائے پی رہے تھے۔ پیالی ہاتھ سے رکھ دی۔ آنکھ بھر آئی۔ کسی معتقد نے کہا اچھا ہوا۔ ہمارا مخالف چل بسا۔ حضرت نے اُسے جھڑکا اور کہا مقامِ گریہ ہے علم کا وہ آفتاب آج غروب ہوا ہے جس کی جگہ لینے والا مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔ اللہ اللہ کس اخلاق کے لوگ تھے۔ معاصرانہ چشمک کو وقتی و آنی معاملہ سے زیادہ نہ سمجھتے اور ایک دوسرے کے مقام سے واقف تھے۔

حکیم عبدالاحد کے علاوہ اُسی دور میں حکیم شیخ احمد بھیروی حکیم سلطان احمد ترک۔ حکیم امیر علی اور حکیم آصف علی بھی بلند پایہ طبیب گزرے ہیں۔ حکیم آصف علی کے طبی معمولات کا بیاض "یادگار آصفیہ" کے نام سے ایک پبلشر لوٹا رام نے شائع کیا تھا۔ لوٹا رام کا عظیم کتاب گھر سبزی منڈی میں ۴۷ء تک موجود تھا۔ پھر پتہ نہیں چلا اتنی ساری کتابیں دفعتہً کیا ہوئیں۔

میرے والد مرحوم کے مطب میں اہلِ علم و فن کا آنا جانا رہتا اسی فضا میں جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو نامی گرامی شخصیتوں سے تعارف حاصل کیا۔ یہی تقریب میرے ادبی شعور

کا آغاز ہوئی۔ میں کالج میں داخلہ لے چکا تھا۔ جب ایک روز منشی عقیل اپنے ساتھ ایک نوجوان کو لائے جو اُنہی دنوں ڈسٹرکٹ بورڈ سکول میں فارسی کا اُستاد مقرر ہوا تھا۔ معلوم ہوا علامہ ریاض الحق عباسی ہمیں بزرگ است۔ دیوبند کے متعلم اور معلم رہے۔ اور نٹل کالج لاہور میں عربی اور فارسی پڑھائی۔ شعر طب فقہ تاریخ ادب اور حدیث و تفسیر میں ان کے پایہ کا کوئی عالم آج اس اُجڑے دیار میں نہیں ہے۔ بذلہ سنجی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حافظِ قرآن ہیں۔ داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی چٹ کرا رکھی ہیں۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے لئے "نسخۂ کیمیا" کا مستقل پروگرام یہی لکھتے ہیں۔ کئی بار مدعی علماء ان سے ٹکرائے اور بس ٹکرا کر رہ گئے۔ ان کی ہیئت کذائی سے گمان بھی نہیں گزرتا کہ مذہبیات میں ان کے درک کا یہ عالم ہو گا۔ ایک روز ان کے تفہیمی ترجمہ پر ایک مشہور مولوی صاحب کو اعتراض ہوا۔ ملاقات ہوئی تو پوچھ بیٹھے آپ ہی ریاض عباسی ہیں اور کیا نسخۂ کیمیا کا مسودہ آپ ہی لکھتے ہیں۔ عباسی صاحب نے کہا ہاں ؎

مری قرآن دانی پر نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیئے

اس کے بعد تبادلۂ خیال ہوا تو معترض کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے علامہ عباسی ہی کے یہاں حضرت عزیز صہبائی سے میری پہلی

ملاقات ہوئی۔ یہ ۳۵ء کے گلابی جاڑوں کی ایک شام تھی۔ میرے ایک حیدرآبادی فاضل دوست ڈاکٹر بشارت علی جو برلن سے سیاسیات میں ڈاکٹری کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ ان دنوں میرے مکان کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے انہیں مقامی علماء اور شعراء سے تعارف کا اشتیاق ہوا۔ میں انہیں تلوک چند محروم کے گھر بھی لے گیا۔ دستک دی اور محروم صاحب باہر آئے۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ میں نے مدعا بیان کیا۔ اُنہوں نے بیٹھک کھولی۔ گھر بھر میں اندھیرا تھا۔ بیٹھک میں انہوں نے مٹی کے تیل کا ایک لیمپ روشن کیا اور کہا عزیز تم ایسے وقت آئے ہو کہ میں ایک المناک حادثہ کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ میرے دل کی افسردگی آپ پر درو دیوار کی ویرانی سے عیاں ہوگی۔ چند دن ہوئے میری بیٹی ساس بہو کے منزلی جھگڑے کے بعد کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مری ہے۔ یہ اندوہگیں واقعہ سن کر ہم بجھ گئے اور اظہار افسوس کر کے رخصت چاہی۔

واپسی پر مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر بشارت علی کو علامہ یاض الحق عباسی کے پاس لے چلوں۔ ہم وہاں پہنچے تو عزیز صہبائی بھی تشریف رکھتے تھے۔ معلوم ہوا پشاور سے آئے ہیں اور امرتسر وطن مالوف ہے۔ آغا حشر مرحوم سے نسبت تلمذ ہے۔ علامہ صاحب کی فرمائش پر انہوں نے اپنے اور آغا حشر کے چند اشعار سنائے۔ بحر تو شعر ہی کہ تحت اللفظ پڑھنے کی ڈرامائی ادا مجھے بہت پسند آئی پھر علامہ صاحب

نے بھی اپنی غزلیں اور مزاحیہ کلام سنایا۔ قادر الکلامی اُن کے شعر کا وصف ہے۔ علم و ادب کی کسی بھی صنف میں ان کی طبیعت بند نہیں۔ لُغت سے ادب اور ادب سے فقہ و حدیث تک اُن کے ختم نہ ہونے والے ذخیرے اور لطائف و ظرائف کی مارا مار سے ڈاکٹر بشارت علی بہت متاثر ہوئے۔ واپسی پر مجھ سے کہا۔ نہ جانے کس ملک کا یہ ٹوٹا ہوا تارا ہے۔ مجھے یہ شام کبھی نہیں بھولے گی۔

جہاں تک روحانی اُفق کا تعلق ہے پنڈی کی تقدیریں اچھے اچھے درویش آئے۔ ان میں سالک بھی تھے۔ مجذوب اور مغلوب الحال بھی۔ اہلِ خدمت اور قلندر بھی۔ ان سب کا اپنا اپنا رنگ تھا۔ اہلِ حاجات بکثرت ان سے رجوع کرتے۔ اس طرح چند افراد مقدس اداروں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ان اداروں میں بعض باضابطہ خانقاہیں تھیں۔ گولڑہ شریف کا حال آپ پڑھ چکے۔ عیدگاہ والے حافظ عبدالکریمؒ نقشبندی بزرگ تھے اور ان کی خانقاہ بھی مرجع خاص و عام ہے۔

لیکن بعض حلقے وضع داری اور علائق کے پابند نہ تھے۔ مگر بے ضابطگی کے باوصف کشش رکھتے تھے۔ مٹی کے چراغ بھی آخر روشنی تو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرورِ ایام کے باوجود محفلیں اُن کے ذکر سے خالی نہیں۔

حضرت سائیں اللہ بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب صدق وصفا درویش تھے۔ مدت ہوئی ان کا مفصل تذکرہ "مرد قلندر" کے نام سے میں نے لکھا تھا۔ اس لئے اُن کے حالات کا اعادہ تحصیلِ حاصل سمجھ کر نظر انداز کرتا ہوں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے درویشوں میں مغلوب الحال لوگوں کی کثرت تھی۔ ان میں سے بعض کو لوگ دیوانہ سمجھتے۔ لیکن دیوانے کا بھی اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ یہ کہاں ہر شخص کا مقدر ہے کہ عزت اور ناموس کو داؤ پر لگا کر شہر بھر کے آوارہ لونڈوں سے پتھر کھائے اور گالیاں سُنائے۔ بسا اوقات ایسے درویش ملامت کی منزل سے بھی گزر رہے ہوتے ہیں۔ اسی کھیپ کے ایک بوڑھے خدا بخش کو میں نے دیکھا کہ لوگوں کی دلچسپی کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ لیکن وہ سخت جان کس منزل و مقام میں تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ سنہ ۲۱ء کی ایک گرم رات میسی گیٹ کے اندرونی حصہ میں آگ بھڑکی۔ دو تین دکانیں شعلوں کی لپیٹ میں آگئیں۔ آگ بجھانے والا عملہ مصروفِ کار تھا۔ پولیس نے حلقہ باندھ رکھا تھا اور فالتو آدمیوں کو اس طرف جانے نہیں دیتے تھے۔ خدا بخش ہاتھ میں چلم تھامے بار بار آگے بڑھتا اور پولیس والے باہر دھکیل دیتے وہ بڑی دردمندی کے ساتھ التجا کرتا۔ مجھے چلم پہ ایک چنگاری رکھ لینے دو۔۔۔ درد و سوزِ آرزو مندی کی متاعِ بے بہا اسی کو کہتے ہیں۔

ایک اور مجذوب سائیں رجب تھا۔ جوانی میں پیتل کی ڈھلائی کا کام کرتا تھا۔ ایک روز کوئی اللہ کا بندہ اس کی دکان پر آیا اور کان میں کچھ کہہ کر چلا گیا۔ رجب نے کھڑے کھڑے سارا اثاثہ لٹا دیا اور فقیری کا بھیس بدل لیا۔ مشن سکول کے متصل مدتوں بیٹھا رہا۔ پھر ملٹن مارکیٹ کے احاطہ میں آ بیٹھا۔ بے تحاشہ چرس پیتا اور رات دن خود کلامی میں مصروف رہتا۔ نیلی چھت کے نیچے اس کی گرمیاں برساتیں پالے اور بہاریں بیت گئیں۔ چہرہ مہرہ سُرخ و سفید تھا۔ لبوں پر نتھری ہوئی مسکراہٹ تیرتی رہتی۔ میلا چیکٹ کمبل اوڑھے اپنے خیالوں کی دنیا میں رواں دواں رہتا۔ ڈینیز ہائی سکول سے بچے چھٹی کے وقت نکلتے تو شرارت کی راہ سے نعرہ لگاتے۔ "بٹیا رجب افیون کا گولہ کھائے گا۔ چائے کا پیالہ پیئے گا" رجب خوابِ گراں سے چونک کر مغلظات سناتا اور اینٹ پتھر برساتا۔

سائیں رجب آخری عمر میں مری روڈ پر موجودہ چاندنی چوک کے قریب شیشم کے ایک پیڑ تلے اُٹھ آیا تھا۔ پھر لفٹننٹ عالم خاں اس کو اپنے یہاں لے گیا جہاں ۱۹۴۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

مڑ بیر حسن میں سائیں فتو ایک مشہور مجذوب تھا۔ بھوک لگتی تو لئی کنارے سرکنڈوں کے جھنڈ میں جا کر پکارتا "ارر میری مچھلی آ جا" دیکھتے دیکھتے ایک آدھ سانپ برآمد ہو جاتا۔ فتو اسے پکڑ کر کاٹتا اور ٹین کے ڈبے میں مرچ مسالہ ڈال کر بھونتا اور کھا جاتا۔

جھنڈا چیچی کے قبرستان میں اس کا مزار ہے۔ مزار کی تعمیر کا بھی عجیب واقعہ ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندو مسلم فساد کے دوران ہندوؤں کے مکانات جلائے گئے تو ایک مکان کسی مسلمان کا بھی درمیان آگیا۔ اس مسلمان کو سائیں فتو سے عقیدت تھی۔ اضطراری حالت میں کہا۔ "سائیں میرا مکان بچ گیا تو تیرا مزار بناؤں گا۔" خدا کی شان ہے آس پاس کے سارے مکانات راکھ ہو گئے لیکن اس کا مکان محفوظ رہا۔ اس نے منت پوری کی اور مزار بنوا دیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران ایک اور درویش سید تھے شاہ پونچھ سے آئے۔ بھلے گھر کے چشم و چراغ تھے۔ اعلیٰ تعلیم پا کر ریاست میں تحصیلدار ہوئے۔ ایک روز عدالت لگائے بیٹھے تھے کہ شکستہ حال ایک شخص تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور کہا "سید تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

سید تھے شاہ نے عدالت برخواست کی۔ گھر آئے اور عزیزوں سے کہا سنا معاف کرا کے پنڈی آگئے۔ دن بھر بازاروں میں خاموش گھوما کرتے۔ رات کسی تنور پر سو جاتے۔ فجر کے وقت قرآن کی قرأت کرتے۔ سنا ہے پھر بھی وجد میں آ جاتے۔ رتہ امرال کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

پرانے مزاروں میں سے شاہ کی ٹاہلیاں۔ شاہ چن چراغؒ اور تری شاہ لطیف کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

شاہ چن چراغؒ مشہد کے رہنے والے قلندر بزرگ تھے۔ بجا بڑہ خانے کے جس حصے ہیں ان کا مزار ہے۔ وہیں زندگی بھر قیام رہا۔ ہندو کثرت کے ساتھ معتقد تھے۔ طبیعت میں جلال بہت تھا لوگ انہیں ستاتے اور مذاق کرتے۔ آخر جھنجھلا کر کہتے "پنڈی والو تم ہمیشہ علیل رہو اور صحت تمہیں کم نصیب ہو"۔ خدا کی شان ہے یہ بد دعا دوامی حقیقت بن کر رہ گئی۔ ڈاکٹروں کی موٹر گاڑیاں اور شاندار بنگلے حضرتؒ شاہ چن چراغؒ ہی کی کرامت کا نتیجہ ہیں۔

شاہ کی ٹاہلیوں والے بزرگ کا نام سخی جان محمدؒ تھا۔ غیر مصدقہ روایت ہے کہ آپ شاہ چن چراغ کے ہم عصر تھے۔ اوائل جوانی میں ایک روز شیشم کے پیڑ پہ بیٹھے تھے کہ وجد طاری ہوا اور اسی حالت میں زبان سے نکلا "چل ٹاہلی تو بھی چل" شیشم کا پیڑ چل پڑا اور مری روڈ پر جہاں اب ان کا مزار ہے آکر خود بخود ٹھہر گیا حضرت سخی جان محمد صاحب نے یہیں ڈیرے ڈال دئے اور رجوعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تقریباً پچاس برس پہلے تک یہ غیر آباد جگہ تھی۔ لوگ دن دہاڑے لٹ جاتے تھے۔

شاہ لطیف جنہیں عرف عام میں بری امامؒ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ موضع چولیاں تحصیل چکوال میں پیدا ہوئے۔ ان کا مزار پنڈی سے شمال کی جانب دامن کوہ میں واقع ہے۔ اس سرسبز اور شاداب مقام پر سبک رفتار ندی کے کنارے وہ سراپا جمال اور مرد حق آگاہ

آسودہ ہے جس نے اپنی بے پناہ ریاضت اور مجاہدات کا سکہ جما کر ناموری کا تاج پہنا۔ عقیدت کیش دور دور سے اس کے حضور آتے اور جبینِ ارادت کو منور کرتے۔ اس نے یہاں ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ جہاں معقول و منقول کی تعلیم کا انتظام تھا لیکن مزار کی وسعت میں آج اس مدرسہ کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

مزار کی چار دیواری کے باہر مدتوں عیش و عشرت کے ہنگامے بپا رہے۔ ہر سال بہار کے موسم میں عشرہ بھر کے لئے اس خاموش وادی کے قدسی ماحول اور آفاقی فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ اطراف و اکناف سے ڈوم ڈھاری کلاونت اور طائفے آتے۔ بدن کا گداز اور گلے کا لوچ فروخت کرنے والیاں ہجوم کرتیں۔ اور ملک کے گوشے گوشے سے ایرے غیرے اور نو دولتئے حسن و نغمہ کی داد دینے کے لئے لپکتے۔

ہر طرف چہل پہل۔ ہر سمت خرید و فروخت۔ قدم قدم پر خیمے استادہ ہوتے جس میں سرِ شام اُجالا ہو جاتا۔ رات شمع کا نور کی طرح جگمگاتی۔ نو خیز تتلیاں ادائے ناز سے دلوں کو برماتیں۔ دل پھینک عاشقوں کی ٹولیاں جم کر بیٹھ جاتیں۔ ایک چھیلا دوسرے سے بڑھ کر دم مارتا۔ مرمریں پیکر پیچ و بل کھاتے۔ اُدھر زلفیں لہراتیں اِدھر امیدیں چٹکیاں لیتیں۔ سازوں کا آہنگ اور مہ جبینوں کی بجتی ہوئی آواز کا تیر نگ دلوں میں رنگ بھرتا۔ خموش نگاہیں اپنا فسوں

جگائے جاتے۔

اس سنگھاسن پر دس روز تک طوائف کی سلطانی رہا کرتی۔ اور بزم کے سارے چراغ اُنہی کے دیپک راگ سے روشن ہوتے۔ خرافات کا یہ سیلاب فرنگی کے عہد میں شروع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ رَوِ بدستور چلتی رہی تاآنکہ ۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد اس "ناٹک کا ڈراپ سین ہوگیا۔

درسِ خاک بازی

انگریز اپنے ساتھ دو تحفے لایا۔ تہذیبِ نو[1] اور مسیحی مبلغین[2]۔
ان مبلغوں کا ذریعۂ کار تین اڈّے تھے۔ گرجا گھر[1]۔ ہسپتال[2] اور
اسکول[3]۔۔۔ ان تینوں میں سے اہم ترین اڈا نئے طرز کے اسکول تھے
جو برِّ صغیر کے طول و عرض میں جگہ جگہ کھولے گئے۔۔۔ پنڈی کا مشن
اسکول ۱۸۵۶ء کو امریکن پریسبی ٹیرین چرچ نے کھولا تھا۔ پنڈی
اُس زمانے میں کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ پھر بھی اعداد و شمار بتاتے ہیں
کہ انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں اس اسکول کے اندر ایک ہزار
سے اُوپر طلبا تعلیم پا رہے تھے۔
نئے طرز کے مدرسوں کی ابتدا مشن اسکول ہی سے ہوئی۔ نئی
روشنی اور نئی تعلیم وقت کا تقاضہ بھی تھے اور معیشت کا کشکول

بھی۔ چنانچہ اس میدان میں ہندو نے پہل کی۔ ڈی اے وی اسکول آریہ سماج نے کھولا۔ یہی اسکول ترقی کرتے کرتے پہلے انٹرمیڈیٹ اور پھر ڈگری کالج بن گیا۔ اس کی ایک شاخ ٹرنک بازار میں بھی قائم ہوئی۔ یہی حال خالصہ اور سناتن دھرم اسکولوں کا تھا۔ وہ بھی ترقی کرتے کرتے کالج بن گئے۔ کوہاٹی بازار چوک کے پاس جَین ہائی اسکول بھی کھولا گیا۔ لیکن ترقی کی منزلیں طے نہ کرسکا —— اسلامیہ ہائی اسکول کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

چھاؤنی میں سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں کلکتہ دفتر کے بنگالی بابوؤں نے احاطہ مٹھو خان میں اسکول کھولا۔ پھر اُسے پونچھ ہاؤس کی پرانی عمارت میں لے گئے۔ ڈاکٹر دت اس کا نگران تھا۔ کچھ مدت بعد یہ سکول بند ہو گیا۔

انہی دنوں کرنل ڈمینیز نے چھاؤنی کے مقتدر ہندو اور مسلمانوں کے تعاون سے ایک اسکول کی بنیاد رکھی۔ بورڈ کے وجود سے پہلے "کنٹونمنٹ کمیٹی" چھاؤنی کے امور کی منتظم تھی۔ اسی سے ڈلہوزی روڈ پر آٹھ آنہ ماہوار کرایہ پر زمین حاصل کی اور ڈمینیز ہائی سکول کھل گیا۔ اس اسکول کی عمارت سے آگے آبادی نہ تھی۔ بلکہ سکول سے کوئی دس قدم ادھر ایک بنگلہ پارسی ڈاکٹر واتنیا نے بنوایا۔ تو اس کے دوستوں نے کہا کس ویرانے میں رہائش اختیار کر رہے ہو۔ یہاں تو دن دہاڑے لوگ لوٹے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر واتنیا خوش طبع آدمی تھا۔ صدر دروازہ

پرسنگ مرمر کی تختی لگوائی جس پر لکھا تھا Vania's folly یعنی "وانیا کی حماقت"۔

ڈینیز سکول کی مجلس انتظامیہ کے رُکن ڈاکٹر دت۔ سیٹھ آدم جی لالہ رن سکھداس اور نشروان جی جمیس جی تھے۔ لیکن سکول کی حالت اتنی سقیم ہو گئی کہ جنوری ۱۹۰۹ء کو انتظامیہ نے ایک ہنگامی اجلاس میں فیصلہ کیا کہ سکھوں کے چیف خالصہ دیوان اسے اپنی تحویل میں لے کر چلائیں۔

ایک برس کے بعد شیخ فضل الٰہی مرحوم نے یہ سوال اُٹھایا کہ ڈینیز ہائی اسکول پبلک ادارہ ہے۔ اسے کسی ایک فرقے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ نئی انتظامیہ منتخب ہوئی۔ لالہ بیج ناتھ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۰ء سے قیام پاکستان تک اس اسکول کو امتیازی شہرت حاصل رہی۔

چھاؤنی میں اس اسکول کے علاوہ آریہ سماج کا ایک پرائمری اسکول بھی موجود تھا جسے بعد میں سناتن دھرم والوں نے لے لیا۔ مکھ رام منگت رام اسے چلاتے رہے۔

قریب چالیس برس ہوئے۔ کنٹونمنٹ بورڈ نے لال کرتی بازار میں مڈل اسکول کھولا۔ تلوک چند محروم اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے یہاں سے فارغ ہو کر گارڈن کالج میں اُردو کے لیکچرار بنے۔

اسلامیہ اسکول مسلمانوں کا واحد تعلیمی ادارہ تھا۔ اس کے قیام کا

فوری سبب یہ ہوا کہ مشن اسکول میں عربی کلاسیں نہ تھیں اور مشن والے کھولنے کے لئے رضامند بھی نہ تھے۔ دردمند مسلمانوں نے جن میں قاضی سراج الدین بیرسٹر پیش پیش تھے [illegible] اسلامیہ ہائی اسکول بنانے کی تحریک شروع کی۔ بوہرہ برادری کے سیٹھ ماموں جی نے لیاقت روڈ پر جگہ مہیا کی اور سکول قائم ہو گیا۔ دوسرے اسکولوں سے اسلامیہ اسکول کے تقابلی جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان بچے کم کم ذہین اور محنتی نکلتے۔ استاد بھی کم کوشش ہوا کرتے اور مالی لحاظ سے بھی اس اسکول کی حالت چنداں قابلِ تعریف نہ تھی۔ اس اسکول کے نمائندے سکول کے نام پر چندے کی فراہمی کے لئے مارے مارے پھرا کرتے۔ میں نے سنہ ۲۳ء میں بری شاہ لطیف رح کے میلے میں سکول کے ہیڈ ماسٹر اور طلبا کو چندہ مانگتے دیکھا ہے۔ ان تگ و تاز کے باوصف اساتذہ کو مہینوں تنخواہ نہ ملتی۔ سنہ ۳۰ء کے لگ بھگ اس مزمن بیماری کا علاج یہ سوچا گیا کہ ہر سال اپریل کے وسط میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے اور اس اجتماع میں چندہ کی اپیل ہوا کرے۔

ان جلسوں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری تشریف لایا کرتے اور سامعین کو نغمات سے کبھی رلاتے اور یہ حقیقت بیان کیا کرتے کہ مسلمانو ہبوطِ آدم کے بعد ملتِ اسلامیہ کا کوئی کام چندے کے بغیر نہیں چلا ہے۔ اگر آپ کو یہ اسکول بند نہیں کرنا تو اس بیمار کی

بجائی کیلئے شربت ڈینار کا ایثار کیجیے اس طرح پانچ سات ہزار نچوڑ لیا کرتے اور ایک چھ ماہی کا گزارہ ہو جاتا تا۔ برسوں یہی التزام رہا۔ ہندو بغلیں بجاتے، ہنستے اور تماشہ دیکھتے رہے۔ خدا بھلا کرے مرحوم شیخ عبدالغنی کا جنہوں نے آخرکار سکول کو اپنی تحویل میں لے کر مسلمانوں کو چندہ بازی کی لعنت سے نجات دلائی۔

جب ایک اسکول ہی کا چلانا جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوا تو ثانوی تعلیم کے لئے اسلامیہ کالج کا تصور ہی ناممکن سمجھنا چاہیئے دوسری طرف مشن اسکول نے اپنے قیام سے کوئی ۲۷ برس بعد ۱۸۹۳ء کو ایف۔ اے کلاس شروع کی اور کالج کی اپنی عمارت کے لئے تگ و دو کرنے لگے۔ ۱۹۰۱ء میں گارڈن کالج کی موجودہ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ باضابطہ کالج کا آغاز ہوا جس میں تعلیمی نصاب کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بائبل کلاس بھی کھولی گئی۔ اکّا دُکّا مسلمان بھی داخل ہونے لگے۔ تاریخی اعتبار سے گوجرانوالہ کے شیخ دین محمد مرحوم (جو آگے چل کر ہائیکورٹ کے جج اور پھر سندھ کے گورنر بنے) پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کر کے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

کالج کے اسٹاف میں اچھے اچھے پروفیسر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لیکن وہ رعب اور دبدبہ جو پروفیسر عبدالرحمٰن مرحوم کو نصیب ہوا۔ بہت کم لوگوں کے

حصّہ میں آیا۔ پروفیسر مرحوم اجنالہ کے رہنے والے تھے۔ بڑے امتیاز ساتھ ایم اے پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں گارڈن کالج سے منسلک ہوئے۔ میانہ قد و قامت سادہ وضع اور سوکھے ساکھے جسم میں انگریزی ادب کا قاموس لپٹا ہوا تھا۔ سخت گیر معلّم تھے۔ ان کی کلاس میں وہی طلبا خوشی محسوس کرتے جنہیں علم سے واقعی رغبت ہوتی جس طالب علم میں ذوق شوق کی کمی دیکھتے صرف ایک بار شانے ہلا دیتے یا تو وہ کالج چھوڑ جاتا یا سبق تیار کر کے لاتا۔

کالج میں پروفیسر مرحوم کے آخری ایّام تھے کہ شیخ نذر الباقر نامی ایک طالب علم فرسٹ ایر میں داخل ہوا۔ طبیعت کا چنچل اور انتہائی شوخ نوجوان جسے اپنی ذہانت پر بھی ناز تھا۔ اس کی بےباک گفتاری اور شوخی سے تمام پروفیسر عاجز آ گئے۔ بہت دنوں تک پروفیسر عبدالرحمٰن بھی ہوا کا رخ دیکھتے اور شوخیاں برداشت کرتے رہے۔ پرنسپل ای ایل پورٹر نے ایک روز اُن سے کہا کہ مجھ سے تمام پروفیسروں نے شکایت کی ہے کہ یہ لڑکا قابو سے باہر ہے اور میں نے سُنا ہے آپ بھی خاموشی سے اس کا تماشہ دیکھ رہے ہیں اس نوجوان کو تادیب کریں ورنہ کالج کا ڈسپلن خطرے میں پڑا جاتا ہے۔

آئندہ روز سبق شروع ہوتے ہی شیخ نذر الباقر نے سیٹی بجائی۔ پروفیسر صاحب نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور اپنی نگاہیں فضا میں

گاڑتے ہوئے کہا کہ سیٹی بجانے والے کو اس کی عزتِ نفس کا واسطہ ہے کہ کھڑا ہو جائے۔ شیخ نذرالباقر نے سنا مگر مگن رہا۔ پروفیسر صاحب نے پھر اپنا فقرہ دہرایا اور کہا میں سیٹی بجانے والے جنٹلمین سے کہتا ہوں کہ وہ ہمتِ مردانہ سے کام لے اور خود بخود کھڑا ہو جائے میں اُسے کچھ نہیں کہوں گا۔ کلاس روم میں انتہاء خاموشی چھا گئی۔ نذرالباقر بدستور جما رہا تو پروفیسر عبدالرحمٰن برق کی سی تیزی کے ساتھ کرسی سے اُٹھے اور اس کے پاس جا کر کہا۔ میں تم سے مخاطب ہوں تم اپنے تئیں کیا سمجھتے ہو۔

نذرالباقر۔ میں خود کو آپ سے کم نہیں سمجھتا۔

پروفیسر صاحب۔ اچھا یہ بات ہے تو نگاہیں جھکا لو اور بتاؤ کمرے کی چھت میں کتنی کڑیاں ہیں۔

نذرالباقر۔ خاموش رہا اور پہلے ہی سوال میں چوکڑی بھول گیا۔

پروفیسر صاحب۔ یہ نہیں بتا سکتے تو پھر کہو کہ جس سیڑھی پر سے گزر کر بالائی منزل کے اس کمرے میں روزانہ آتے ہو۔ اس کے کتنے زینے ہیں۔

نذرالباقر۔ بدستور خاموش رہا۔

پروفیسر صاحب۔ خیر اتنا ہی بتا دو جس کمرے میں رات سوئے تھے۔ اس میں کتنے دروازے کتنی کھڑکیاں ہیں۔

نذرالباقر۔ جواب ندارد۔

شوخی تمام ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ پروفیسر صاحب نے ایک خود سر طالب علم کا بگڑا ہوا دماغ جو سر آسمان تھا فرشِ خاک پر گرا کر کلاس برخاست کر دی۔

نذرالباقر کلاس روم سے نکلا۔ کالج آفس گیا اور سرٹیفکیٹ لے کر لاہور چلا گیا۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے داخلہ دے دیا۔ وہیں سے نذرالباقر بی اے ہوئے۔ آئی سی ایس کے مقابلے میں شرکت کی اور کامیاب ہو کر انگلینڈ گئے۔ ایس این بکیر غالباً اختصار کے لئے اپنے نام کی جگہ لکھنا اختیار کیا۔ پاکستان بنا تو ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۵۸ء کے مارشل لاء میں سکرین آؤٹ ہو گئے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن مدت العمر پنڈی میں رہے۔ آب و ہوا کبھی راس نہ آئی مگر پنڈی سے باہر جانا گوارا نہیں کیا۔ گورنمنٹ کالج بمبئی کے پرنسپل کی آسامی کے لئے ان کا انتخاب ہوا لیکن انکار کر دیا۔ کابل کی حبیبیہ یونیورسٹی نے بھی پیش کش کی لیکن نہیں گئے وہ طبعاً زاہد خشک کم گفتار اور کم آمیز تھے۔ مغرب کے وقت ذرا دیر کو گھر سے نکلتے اور ایک تفریحی چکر لگا کر گھر پلٹ جاتے۔ انہوں نے انگریزی اردو اور فارسی میں اشعار بھی کہے ہیں۔ یہ ذخیرہ ان کی الماری میں اب تک محفوظ ہے۔ مرض الموت تک ڈائری لکھنے کا التزام رہا۔

ایک مرتبہ اُن کے قلمی ذخائر کو دیکھنے کا اُس وقت موقع ہوا جب اُن کے منجھلے بیٹے ضیا محمود نے مجھے اُن کی سوانح مرتب کرنے کی دعوت دی تھی۔ کاش میں اس کام کو کر سکتا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حالات کی گراں جانی اور حوادث کے تھپیڑے مجھے پنڈی سے باہر نکلنے پر مجبور کر چکے تھے۔ میں لوٹ کر آیا تو ضیا محمود پنڈی سے باہر جا چکے تھے۔

میں افسوس کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ نابغہ جس کا نام پروفیسر عبدالرحمٰن تھا اور جس کی بے پناہ قابلیت اور ہمہ دانی کا غلغلہ کبھی پنڈی کی علمی فضاؤں میں بپا تھا، رفتہ رفتہ نسیاً منسیا ہو رہا ہے۔ میں نے نامی گرامی شخصیتوں کو پروفیسر مرحوم کی شاگردی پر فخر کرتے دیکھا ہے۔ بخشی ہربنس سنگھ ایم اے ایل ایل بی جو میرے زمانۂ تعلیم میں گارڈن کالج کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ تھے۔ بڑی شدومد کے ساتھ لیکچر دیا کرتے۔ اُن کے فقروں کی دروبست حیران کُن ہوتی۔ کبھی کبھی موج میں آ کر اعتراف کرتے کہ یہ سارا فیضان پروفیسر عبدالرحمٰن کا ہے جنہوں نے مجھے ایسا حسین نطق بخشا ہے اور جب کبھی اُن کی زبان پر پروفیسر مرحوم کا نام آتا۔ ان کی آنکھوں میں والہانہ عقیدت کی چمک پیدا ہو جاتی اور واقعات کا دفتر کھل جاتا۔ ہم محسوس کرتے کہ پروفیسر مرحوم کے مختصر وجود سے ایک دیو پیکر شخصیت اُبھر کر نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے۔ ایک روز

اُنہوں نے پروفیسر مرحوم کی خودداری کے ذیل میں سنایا کہ کسی اہم کالجی تقریب کے موقعہ پر انتظامیہ نے دعوتی کارڈ چھپوائے جس میں کچھ ایسے الفاظ تھے ــــ امریکن سٹاف کی خواتین ([illegible]) اور انڈین سٹاف کی بیویوں ([illegible]) کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے" پروفیسر مرحوم انڈین سٹاف کی توہین برداشت نہ کر سکے اور اس تقریب میں احتجاجاً شریک نہ ہوئے۔ پرنسپل کو غلطی کا احساس ہوا تو خود اُن کے گھر معافی مانگنے کے لئے گیا۔

گارڈن کالج میں کیمسٹری کے ایک پروفیسر ڈبلیو جے ڈاؤنز تھے۔ کتابی چہرا چوڑا چکلہ سینہ اور طویل قامت بزرگ تھے طبعاً اتنے تیز واقع ہوئے تھے کہ سٹاف اور طلبا سب اُن سے خوف کھاتے۔ میں نے کالج میں داخلہ لیا تو فرسٹ ایر کی بائبل کلاس وہی لیتے تھے۔ میں تیلا دبلا اور کالج میں سب سے کم عمر طالب علم تھا۔ انگریزی مجھے بولنا آتی نہ تھی۔ ویسے بھی ڈاؤنز کے گول مٹول لہجے کی وجہ سے بعض باتیں ہی سمجھ میں نہ آتیں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب میں مانوس ہو گیا اور وہ اپنی عادت سے مجبور اسلام کو ہدف بناتے چلے گئے تو میرے دماغ کی رگیں بیدار ہونے لگیں ایک روز اُنہوں نے مسیحی مبلغوں کے کارناموں پر لیکچر دیا اور اسلام پر بزورِ شمشیر اشاعت کی تہمت رکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے اس خوف کو بھی دل سے نکال دیا کہ ڈاؤنز نے پچھلے دنوں ایک

مسلمان لڑکے کو گراؤنڈ میں بے تحاشہ پیٹا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ صاحب جی بقول آپ کے مسیحی تبلیغ کے انداز معشوقانہ سہی پر جان کی امان پاؤں تو پوچھنے کی جسارت کروں کہ گزشتہ ربع صدی کے اندر تعلیم کے ساتھ تبلیغ کی مشقت کے نتیجے میں آپ کے اس ادارے نے کتنے مسلمان طلبا کو بپتسمہ دلایا ہے۔ زمین شور تھی یا بیج کے نقص کی وجہ سے فصل بارآور نہیں ہو سکی۔

ڈاؤنز جھلا گیا اور تیور بگاڑ کر کہا لاریب درست ہے کہ ہم کسی مسلمان کو عملاً اپنا ہم خیال نہیں بنا سکے۔ مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وہ جب فارغ التحصیل ہو کر یہاں سے نکلتے ہیں تو مسلمان بھی کب رہتے ہیں۔ میں نے مناظرہ میں شکست کا اعتراف خاموشی کے ساتھ کر لیا۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ ڈاؤنز کی غضبناکی کتنی بڑی حقیقت بیان کر گئی اور بقول جگر ؎

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اب تو زمانے کی دوڑ اتنی تیز ہو چلی ہے کہ مسلمان طلبا بڑی حد تک دین سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے زمانے میں کہا تھا اور آج بھی صورت حال پہ ٹھیک چسپاں ہوتا ہے

؎

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

یادوں کی سڑک

یہ بظاہر ایک سڑک ہے لیکن اس پر سے نہ صرف تہذیبوں کے کارواں گزرے بلکہ یہ بذاتِ خود مستقل ثقافت کی آئینہ دار بھی رہی۔ اس کا عُرفی نام ریلوے روڈ ہے۔ ہر تازہ وارد کو شہر کے مختلف حصّوں میں پہنچنے کے لئے اوّل اوّل اسی کی خاک پھانک کر نکلنا پڑتا ہے۔ اس کے بغلی کوچہ و برزن میں مساجد بھی ہیں۔ مندر اور گوردوارے بھی۔ اس کے دائیں بائیں حاشیوں پر نائیوں کے ٹھڑے۔ موچیوں کے سٹنڈ یہ۔ افیون اور بھنگ کے ٹھیکے۔ اُجلے میلے سستے مہنگے ٹھوک اور پرچون قسم کے ہوٹل اور شکستہ سرائیں ہیں۔ بھک منگوں۔ سڑک حکیموں اور پتّے بازوں کے لشتم پشتم ٹولے ہر طرف ڈیرے جمائے بیٹھے ہیں۔ لیکن سب سے دلچسپ قصّہ اُن

اُٹھائی گیروں کا ہے جو ماضی کی پہنائیوں میں ڈوب گئے۔

جس عہدِ ماضی کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس وقت یہاں ہر کینڈے کا نوسر باز اور ہر قماش کا بدمعاش موجود تھا۔ ان میں ہندو سکھ اور مسلمان سبھی شامل تھے لیکن سادھو سنگھ نیلامی والے کی ٹولی امتیازی شان رکھتی تھی۔ سادھو سنگھ کے چیلے چانٹے قانون کی گرفت سے آزاد پیہم مصروف رہتے کیونکہ اُنہیں مقامی انتظامیہ کا باضابطہ تعاون حاصل تھا۔ اُن کی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ اکثر و بیشتر مسلمان اور بالخصوص وہ فوجی جوان بنتے جو راجہ بازار کا پر رونق میلہ دیکھنے یا خرید و فروخت کے لئے اپنی بارکوں سے نکلتے تو یہی سڑک اُن کے لئے قریبی راستے کا کام دیتی اور وہ ان لٹیروں کے چنگل میں آ پھنستے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بھولے بھالے دور افتادہ علاقوں اور دیہاتوں کے رہنے والے ہوتے جہاں کی سادگی شہروں کی مسموم فضا سے آشنا نہیں تھی۔ اُنہیں شہری لٹیروں کے آرٹ اور ٹیکنک ہی کا سرے سے شعور نہ ہوتا کہ کس کس رنگ سے یہ ماہرِ فن اُنہیں لوٹ لیتے ہیں۔

اُس زمانے میں ریلوے روڈ کے طول و عرض میں چند مخصوص اڈے تھے جو سہ پہر سے غروب آفتاب تک مصروفِ کار رہتے اور انجان لوگ روزِ روشن میں کپڑے اُتروا کر چپ چاپ چلے جاتے۔

سٹے بازوں اور قمار بازوں کے علاوہ اُن دنوں اس سڑک پر مجمع باز حکیموں کی گرم بازاری تھی۔ یہ لوگ اپنے بھنگے ڈھنڈورے پھیلا کر بیٹھتے اور مُردوں کو زندہ کرنے والی اکسیروں کے افعالُ خواص گنوا گنوا کر اپنے "کارخانوں" کی مشہوری کے لئے بیش قیمت دوائیں سستے داموں بیچا کرتے۔ سنہ ۱۹ء کے لگ بھگ سادھو سنگھ گروپ کا ایک رکن بیلی رام بھاٹلہ یہاں طاقت کی گولیاں بیچا کرتا۔ چند برس میں سرمایہ جمع کر کے خود تو پنساریٹہ کھول لیا اور سڑک حکیمی کے لئے اپنے ایک شاگرد بالمکند کو جانشین کیا۔ بالمکند نے اُستاد کی شمع سنہ ۴۷ء تک گل نہ ہونے دی۔ وہ پست قد و قامت کا دُبلا پتلا کاغذی جوان تھا اس کے چہرے پر دو فتنہ روش آنکھوں اور گھنی مونچھوں کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ لکڑی کے جالے کی طرح وہ سوکھا ساکھا مسیحا جب ایڑیاں اٹھا اٹھا کر بیچ بلاتا تو ہر ایک فقرے پر دم کشی اور تنفس کے کارن یہ احساس ہوتا گویا کہہ رہا ہے "گولی کو میرے ہاتھ سے لینا کر چلائیں" لیکن وقت کی گردش اس کی سخت جانی پر گواہ ہے۔ کتنی جنازے اس کی آنکھوں کے سامنے خود اس کی اپنی "اکسیری گولیوں" کے صدقے میں اُٹھ گئے۔ لیکن وہ خود داہگہ کی سرحد عبور کر گیا۔

ایک اور صاحب مسکین شاہ عاملِ جنات تھے۔ نام کو تو

مسکین شاہ تھے مگر بڑے خوش پوش بزرگ اور تن و توش کے اعتبار سے الفربہ خواہ مخواہ معتبر نظر آتے۔ سر پہ طلائی کلاہ اور یزدی دستار رکھتے۔ جس کی اوٹ سے دائیں بائیں کالی کالی معطر زلفیں اُڑتی لہراتی اور پیچ و بل کھاتی دکھائی دیتیں۔ ہاتھ میں لیکچر کے ہنگام تیغِ بے نیام رکھتے۔ اکھاڑہ جم جاتا تو روزگار میں برکت۔ مقدمہ میں فتح۔ امتحان میں کامیابی اور جورو کو مطیع کرنے کا تعویذ ہدیہ حاضرین کرتے اور فرماتے یہ فقیر اس تحفۂ پیر کو نوچندی اتوار کی رات تکالے باغ کے دریا میں بیٹھ کر لکھتا ہے اور اس تحفۂ بے بہا کی قیمت نہ آپ دے سکتے ہیں۔ نہ میں لے سکتا ہوں۔ ہاں محض خرچے بھاڑے کی غرض سے اتنا قلیل ہدیہ رکھا ہے کہ گھاس کھودنے والا جوتی کے پالش کرنے والا اور غریب سے غریب شخص بھی دے سکے اور اس ’’یادگیری‘‘ تحفے کو صرف آٹھ آنے میں لے جاکر تمام عمر فقیر کو دعائے خیر سے یاد رکھے۔ جس کسی بزرگ بھائی یا بہن کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کر کے مانگ لے۔ پانچ منٹ کے بعد بیان بند کر دوں گا اور پھر لاکھ روپیہ بھی دو گے تو ہرگز نہیں دوں گا۔ یہ میری عادت ہے بھائیو کسی سے عداوت نہیں۔ میرے دوستو میرے بزرگو آٹھ آنے کوئی بڑا خزانہ نہیں جو لے کر امیر کبیر بن جاؤں گا۔ پان کھا کر تھوک دیتے ہو۔ سگریٹ پی کر اڑا دیتے ہو۔ جیب کترا نکال لے جاتا ہے

یا رشوت خور اہل کار کو حرام کے راستے میں دے دیتے ہو۔ میرے پیارے مسلمین بھائیو یہ چیز تو ہر وقت کام آنے والا ہتھیار ہے جسے اپنی جان کے ساتھ عزیز رکھو اور ہر جمعرات کو حرملی گوگل کی دھونی دو۔ بھائی صاحب شرم نہ کرو اور آواز "کرکے" مانگ لو۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم اور جس نے کی بے حیائی اس نے کھائی دودھ ملائی۔ یقین رکھو کیونکہ یقین کا بیڑا پار ہے اور بھول نہ جاؤ کہ اچھی بیوی۔ عزیز دوست۔ وفادار نوکر اور انمول تحفہ قسمت کے بغیر ہاتھ نہیں آتا لہذا جیب ٹٹولو اور عجلت کرو)

جو عورت اپنے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعویذ مانگتی اس کو سائیں صاحب قبلہ سنکھیا سے تعویذ لکھ کر دیتے اور ہدایت کرتے کہ پانی میں گھول کر پلا دیجو۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ تعویذ اندر اور شوہر کا دم جالندھر ہو جاتا۔

ایک اور فرنچ کٹ داڑھی والے حکیم امیر خاں بڑے عالی نسب مٹرک حکیم گزرے ہیں۔ یہیں اُس کا مجمع بھی لگا کرتا۔ رنگا رنگ اور مختلف نسلوں کے سانپ اس کے سامنے پٹاریوں میں پھن پھیلاتے جھولتے اور جھومتے نظر آتے۔ جن خوش نصیبوں کے پاس فارغ وقت ہوتا وہ حکیم صاحب سے سانپوں کی کہانیاں سُننے کے لئے گوش بر آواز پائے جاتے۔ لیکن اوقات اس انہماک میں سادہ ہونگھ کے چیلے چانٹے ہاتھ کی صفائی دکھا کر لوگوں کے جیب و دامان کا

بوجھ ہلکا کر دیتے۔

امیر خان سانپوں کی حکایت کہتے کہتے یک لخت کانٹا موڑ کر طاقت کے بے مثال کشتے کا ذکر چھیڑ دیتا اور جنسی علامات کا پوری شرح و بسط کیساتھ (شرع میں کوئی شرم نہیں کہہ کر) ذکر کرتا تاکہ یہ قیمتی مطالب حاضرین کے ذہن نشین ہو جائیں۔ پھر پورے احترام کے ساتھ پنڈت کوکا کے تذکرہ پر اپنے لیکچر کو ختم کرتے ہوئے حسرتناک لہجے میں کہتا کہ تف ہے بدنصیبی پر۔ ہندوؤں میں تو پنڈت کوکا گزرا ہے لیکن مسلمانوں میں "بوکا" تو پیدا ہوا لیکن کوئی مولوی "کوکا" بر آمد نہیں ہو سکا۔ ہائے افسوس ہر فن میں غیر مسلم میدان مار گئے۔

دوائی کے محاسن گنوانے کے بعد وہ یہ انکشاف بھی کرتا کہ اس کی مقوی دوائیں دنیا کے ہر حصے سے لوگ بذریعہ ڈاک منگواتے زندگی کا لطف اٹھاتے اور تعریف کے ہزاروں خط روزانہ اس کے پاس آتے ہیں۔ ایک روز ابھی یہ جملے وہ کہہ ہی رہا تھا کہ مجمع میں ایک بچہ داخل ہوا اور ایک پرچہ اس کے ہاتھ میں تھما گیا۔ امیر خان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ دیکھئے غالباً کسی نے میری دوا کی تعریف میں یہ دستی رقعہ بھیجا ہے۔ یہ کہہ کر دائیں جانب کھڑے ایک شخص سے کہا کہ رقعہ حاضرین کو سنا دو۔ اس شخص نے چشمہ لگا کر باآوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا "عزرائیل نے ایک روز اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ اے رب کائنات میں بھر پایا۔

اتنی سخت ڈیوٹی تو کسی دشمن کو بھی نہ ملے۔ میری عاجزانہ درخواست ہے کہ حکیم امیر خان کو جو تیری ملاقات کا وسیلہ ہے۔ اپنے پاس بلا لے یا مجھے مزید خدمت سے معذور جان کر ڈیوٹی سے فارغ کر دے ــــ"

یہ سنتے ہی لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ امیر خان کے حجرے کی رگیں پھول گئیں۔ رقعہ بھیجنے والے کو گالیوں سے نوازا لیکن اسی ادھیڑ بن میں مجمع اُکھڑ گیا۔

اُنہی دنوں سرحدی قبائل کے سُود خوار پٹھانوں کے ایک گروہ نے بھی سڑک حکیمی اختیار کی یعنی ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی۔ یہ پیشہ آج بھی بڑی حد تک اُنہی کے ہاتھ میں ہے۔ بالخصوص یہ کوہستانی طائفہ "مومیا ہی" کی تعریف ایسی فصیح و بلیغ اور شستہ اُردوئے معلیٰ میں بیان کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے ذرا غم روزگار سے رخصت ملے تو بقیہ عمر ہم اُنہی کے مجمع میں گزار دیں۔

جو کچھ ریلوے روڈ کے بارے میں اُوپر بیان ہو چکا ہے وہ جملہ معترضہ سمجھئے۔ اس سڑک کا مایہ ناز کارنامہ سادھو سنگھ کی نیلامی کا شہرۂ آفاق اڈا تھا۔ جو انیون کے ٹھیکے کے دائیں ہاتھ ایک بوسیدہ دکان کے تھڑے پہ جمایا جاتا۔ ڈالس پر اُونی سوتی ریشمی کپڑوں کے کٹ پیس۔ تہہ بند۔ چادریں۔ تولئے۔ بنیان۔ خوشبودار صابن ٹائم پیس اور رسٹ واچ گھڑیاں بڑے قرینے سے سجائی جاتیں۔

سٹیج پر ایک مضبوط ہارڈ کا ہندو رجسٹر کھول کر کانوں میں پنسل دبائے بیٹھا ہوتا۔ اس شخص کو نیلام گھر کا ٹھیکیدار کہتے تھے۔ سہ پہر کے وقت ساد ہو سنگھ اپنی گلابی پگڑی کے اکڑے ہوئے طرے سمیت ڈائس پر کھڑا ہوتا اور کپڑے کا گز دو گز ٹکڑا فضا میں لہرا کر اپنے سامنے پھیلاتا اور بلند آواز میں واہ گورو جی کی فتح پکار کر نیلامی کا آغاز کرتا۔ اس کی گرج دار آواز سنتے ہی ٹولی کے امدادی کارکن دائیں بائیں سے آکر مجمع میں لگ جاتے۔ بولی شروع ہو جاتی جو ابتدائی آنے دو آنے کی جوئے کم آب سے گزر کر آناً فاناً دو چار روپے کے بحر بیکراں تک پہنچ جاتی۔ اگر آخری بولی دینے والا کوئی سادہ لوح مسلمان ہوتا تو فوراً ایک دو تین کر کے رقم وصول کر لی جاتی اور اگر اپنی منڈلی کا کوئی ایجنٹ ہوتا تو ٹھیکیدار کہتا کہ ساد ہو سنگھ جی مال نہیں جائیگا آٹھ آنہ "نقصان" دے کر زبان چھڑوا لو۔ چنانچہ آٹھ آنے اپنے ایجنٹ کو تھما کر دوسری چیز کی نیلامی شروع ہو جاتی۔ جب "نقصان" کے نام سے یہ رقمیں بار بار تقسیم ہوتیں تو حاضرین حیران ہو کر دیکھتے عجیب لکھ لٹ بیوپاری کا نیلام گھر ہے۔ جہاں مال بیچنے کی جگہ "نقصان" دیا جا رہا ہے۔ یوں نیلامی جاری رہتی اور بولی کے تیا سب سے کبھی کبھی روپیہ دو یا تین روپیہ تک نقصان کی رقم بولی کنندگان کو ادا ہوتی چلی جاتی۔ اس دوران مجمع خوب جم نکلتا اور "نقصان" کی مد میں مفت رقم وصول کرنے والے عقل مند خاصی تعداد میں

جمع ہو چکتے۔

اس وقت ٹھیکیدار مخمل کے ڈبے سے راسکوپ میکر کی پاکٹ گھڑی نکال کر سادھو سنگھ کو دیتا۔ نیلامی کا نقطۂ عروج گھڑیوں کی نیلامی ہوا کرتی۔ اب سادھو سنگھ ایک روپیہ چار آنے والی راسکوپ واچ کو پہلے تو اپنے کانوں سے لگاتا۔ پھر پورے مجمع میں گھماتا اور حاضرین کے کانوں میں ٹک ٹک کی آواز سنوا کر یہ پینترا جماتا کہ چاندی کے ڈائل والی یہ گھڑی بالکل نئی اور چالو حالت میں ہے۔ دیکھیں کون خوش قسمت بولی لگاتا ہے۔ چنانچہ ٹولی کا کوئی ایجنٹ چار آنے سے بولی شروع کرتا۔ جس پر سادھو سنگھ صدیوں کا کرب اپنے داڑھی والے فربہ چہرے پر بکھیر کر کہتا۔ یہ ہے تمہارا انصاف چاندی کی گھڑی کے چار آنے دام لگاتے ہو۔ درآں حالیکہ مٹی کا گھڑا بھی چار آنے میں نہیں ملتا ہے۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔ تمہاری خوشی ہے جو چاہو سو بولو۔ دوسرا ایجنٹ پہلے سے بڑھ کر دم ملتا اور ساڑھے چار آنے کی آواز لگاتا۔ سادھو سنگھ پر گمبھیر سکوت طاری ہو جاتا کیونکہ خموشی معنیٰ دارد کہ در گفتن نمی آید ـــــ اس وقفہ کے بعد ٹولی والے بولی کو اٹھاتے لئے جاتے اور آٹھ دس روپے تک پہنچا دیتے۔ اتنے میں ٹھیکیدار کہتا بولی بند کرو۔ پچاس ساٹھ روپے کی گھڑی دس پندرہ میں نہیں جانے کی۔ تین روپے "نقصان" دے دو اور گھڑی ڈبے میں رکھو ـــــ اب تین روپیہ مفت حاصل کرنے

کے لالچ میں تقابلی دوڑ شروع ہو جاتی اور بولی بیس تیس روپے تک جا پہنچتی۔ دیکھتے دیکھتے ایک ڈونٹ کا نقارہ بج جاتا اور کوئی غریب مسلمان بھرے بازار میں لُٹ جاتا۔

اگر کوئی شخص معاملہ فہم ہوا اور از راہ ہمدردی خریدار کو اصل حقیقت سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا تو اس وقت سادھو سنگھ کے چیلے اس ناصح کے ایسے زوردار چانٹے رسید کرتے کہ چہرے کی مرمت ہو جاتی۔

یہ لیل و نہار تھے کہ ایک روز مزا آگیا۔

ہوا یہ کہ فوج کا ایک حوالدار نیلامی کے پنڈال میں کھڑا یہ سب رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا جب رہا نہ گیا تو تنقید شروع کر دی سادھو سنگھ نے بہ نفس نفیس اس کو آڑے ہاتھوں لیا اور لاتوں گھونسوں سے تواضع کے بعد مجمع سے باہر دھکیل دیا۔ وہ سر سہلاتا تھانے پہنچا لیکن نتیجہ معلوم ــــ!

اگلے دن عصر کے وقت وہ حوالدار اپنی یونٹ کے دس بارہ کڑیل جوان ہمراہ لایا۔ یہ لوگ ایک ایک کر کے مجمع میں شامل ہوتے گئے۔ صرف ایک آدمی جانے وقوع سے ذرا ہٹ کر اوٹ میں بیٹھ رہا۔ اس کی تحویل میں مختلف حجم اور تراش کے لٹھ اور مرچیں گھوٹنے والے ڈنڈے تھے۔

مجمع اس روز بڑھی رونقوں پر تھا "نقصان" کی مد میں گراں قدر

رقمیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ سادہو سنگھ اپنی پاٹ دار آواز میں بولی کے حصے اُٹھا رہا تھا۔ مجاہد فورس کے جوان جو سفید کپڑوں میں تھے پہلے تو ہواؤں کے رُخ کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے بھی اکّا دکّا بولی لگانا شروع کی۔ لیکن نیلامی ٹولی والے ان نرالے بولی والوں کے عزائم سے آخر تک مطلع نہ ہو سکے۔ آخر الامر گھڑی کی نیلامی کا لمحہ آ گیا اور انتظار بھی اسی شبھ گھڑی کا تھا۔ اب مجاہدوں نے دوسرے اہلِ مجمع کی طرح گھڑی کی ٹک ٹک اپنے کانوں سنی اور زیرِ لب مسکرائے۔

بولی شروع ہوئی تو چھوٹتے ہی ایک مجاہد نے دس روپیہ قیمت لگائی۔ اس غیر متوقع صدا سے سادہو سنگھ کے کان کھڑے تو ہوئے تاہم اس نے غزل کے مطلع کو اپنے مخصوص انداز میں دہرایا۔ دوسرے مجاہد نے بولی کو چڑھا کر بیس روپے تک پہنچا دیا۔ حسنِ اتفاق کی بدولت آج سوا روپے کی راسکوپ کے بھاگ جاگ اُٹھے۔ آنِ واحد میں بولی پچاس سے اُوپر نکل گئی۔ سادہو سنگھ کو شک گزرا کہ یہ لوگ جعل ساز معلوم ہوتے ہیں یا خوش طبعی کے لئے تمسخراً بولی اُٹھا رہے ہیں۔ اس نے آخری بولی لگانے والے سے اپنی زبان میں پوچھا "سالے تم کو گھڑی لینا بھی ہے یا ٹیں ٹیں فضول بکواس کر رہے ہو۔ اس نے جواب دیا "سالا تیرا حرامی باپ ہو گا ہم تو آج تیری نیلامی کا سارا جھگڑا چکا کر ہی دم لیں گے۔" اس

پرساد ہوسنگھ نے بھی موٹی سی گالی نکالی۔ گالی سنتے ہی مجاہد تمام کے تمام مجمع سے باہر نکلے اور اپنے سٹور کیبر سے مرچیں گھوٹنے والے ڈنڈے لے کر مسالحہ پیسنے کے لئے مورچہ میں واپس آگئے۔

اوّل اوّل انہوں نے ماہرِ فن کی طرح ڈنڈوں کو ہوا میں لہرایا اور گھمایا۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر ساد ہو سنگھ کے کوٹ کی گرد جھاڑی اور آخر میں ایک ضرب کاری اس کے جبڑے پر ماری کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک کا لاکھا ابھر آیا۔ اس ناگہانی یورشس اور دے مار دھاڑ سوا چار سے گھبرا کر ساد ہو سنگھ نے بھاگ کر افیون کے ٹھیکے میں پناہ لی —— اب اس مردِ فربہ کی باری آئی جو ٹھیکیدار کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا۔ اس کی ناک کا بانسہ ڈھل گیا اور بائیں آنکھ سوج کر بند ہو گئی۔ یاس ابرِ باراں کے دوران ساد ہو سنگھ ٹولی کے سارے مرنے مارنے والے وفادار کارکن برابر والی دکانوں کے تھڑوں کے نیچے دبک گئے اور دیکھتے دیکھتے سٹیج تمام اداکاروں سے خالی اور نیلام گھر مجاہدوں کی پامالی کا نشانہ بن گیا۔ انہوں نے جب جنسِ آدم کو بخشش نظر نہ پایا تو بے بان کپڑوں کی گانٹھیں کھول کر ریشمی اونی اور سوتی کٹ پیسوں کو لیر لیر کر کے دھجیاں بکھیر دیں۔ کئی ٹائم پیسوں کے الارم بیک وقت چل ہوئے۔ راسکوپ گھڑیوں کی جگہ ڈائس پر سیئر پارٹس کا انبار لگ گیا۔ پولیس کے سنتری ہوٹل میں چائے پینے کی خاطر چلے گئے۔ تماشائی

انگشت بدنداں کھڑے رہ گئے۔ مجاہد فورس کا دستہ لٹھ بدست فاتحانہ انداز میں علیؓ علیؓ کے نعرے لگاتا ہوا ریلوے سٹیشن کی طرف ٹل گیا اور کچھ دیر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ رونق میلہ جو صرف دس پندرہ منٹ میں طے ہوا۔ دس پندرہ برس کے صبر و ضبط کا منطقی نتیجہ تھا اور خدا کی شان ہی کچھ ایسی ہے کہ الٰہی منطق کے تمام مقدمات اسی نوع کے فطری نتائج پر پہنچ کر دم لیا کرتے ہیں۔ شاعر نے کہا تھا ؎

انتقامِ ظلم گِن گِن کے لئے
دن گِنے جاتے تھے اس دن کے لئے

کہنے کا مقصود یہ ہے کہ لٹھڑی والے اسی انداز میں اگر عوام الناس کے مصائب میں عملی امداد کرتے رہا کریں تو معاملات بآسانی سلجھ سکتے ہیں۔

جب یدھ تمام ہوا تو سادھو سنگھ اپنے شانوں اور داڑھی کو سہلاتا تا خون تھوکتا برآمد ہوا۔ معلوم ہوا چار دانت اپنے مقام ہی میں ہیں۔ مگر ذرا ہل گئے ہیں۔ استاد الاطبا خاندانی نبضی حکیم شیر شاہ نے جو اس سڑک پر بذریعہ کلامِ الٰہی دانت نکالنے کا کام کرتا تھا تمام دانتوں کا ملاحظہ کیا اور نمک کے غرغرے کرنے کا مشورہ دیا ٹھیکیدار کی بند آنکھ اور متورم ناک کے لئے پھٹکری کی ٹکور تجویز کی اس دوران دوسرے ہمدرد، غمگسار اور جاں نثار بھی بولنے لگے

کسی نے سادھو سنگھ سے کہا میں جانتا ہوں کہ یہ فوجی فلاں کمپنی کے جوان ہیں۔ تم کل کلاں بدمعاشوں کو لے کر چلو اور ان کے یونٹ پر حملہ کردو۔ ٹھیکیدار نے اپنی بند آنکھ پر رومال پھیرتے ہوئے کہا "گولی مارو جی۔ مٹی ڈالو جی۔ ایسی بھی دھاندلی کہیں دیکھی ہے کہ پولیس والے کھلی آنکھوں تماشائی رہے اور یہ حملہ آور راونڈ کے سانڈ کی طرح ھنگڑا ڈالتے رہے۔

ایک بزرگ نے پوچھا اندازاً کتنا کچھ نقصان اپنا اس بلوے میں ہوا ہوگا۔ سادھو سنگھ نے جواب دیا کہ دو ہزار سے کیا کم رہا ہوگا۔

ایک خیر اندیش بولا:۔ کوئی فکر نہیں "نقصان" تو آپ ہمیشہ نیلامی میں برداشت کرتے آئے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے بے زبان گھڑیوں کے نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو ہی جائے گی۔ آپ مادھو لال مداری سے ملیں۔ وہ سونے کی گھڑیاں ہاون دستے میں کوٹ پیس کر سالم برآمد کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔

القصہ سادھو سنگھ کو آج وہ باتیں بھی سننا پڑیں جو عام حالات میں سننے کا عادی نہیں تھا۔ نہ جانے اُسے کیوں چپ سی لگ گئی تھی۔ غالباً

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

حکیم شیر صاحب نے کہا" بھائی سادہو دیر نہ کرو۔ ابھی ضرب تازہ ہے۔ نمک کے غرارے کر ڈالو۔ ورنہ چوٹ ٹھنڈی ہو گئی تو مشکل پڑے گی۔ ایک پیتے باز بولا کہ نمک بھی عجیب خداداد نعمت ہے۔ سالن میں نمک۔ روٹی میں نمک۔ منجن میں نمک۔ ابھی اس نے فقرہ مکمل نہ کیا تھا کہ کوئی شخص بیچ میں بول اٹھا" اور زخموں پہ نمک" ——— اور پھر گلا صاف کرتے ہوئے خطیبانہ انداز میں اپنے سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا" بھائیو نمک کا حق ہی سرے سے ادا نہیں ہو سکتا۔

اتنے میں منڈلی کا ایک کارندہ سگریٹ میں چرس بھرتے ہوئے دھیمے سروں میں یوں نوا پیرا ہوا" ہاں صحیح بالکل صحیح ہے۔ نمک کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا اور اس کی تائید وہ پولیس والے بھی کریں گے۔ برسوں سے جن کے روزینے ہم نے باندھ رکھے تھے۔

اللہ کے نام پر

ایک پُل ہے جو شہر کو چھاؤنی سے ملاتا ہے۔ اس کو عرفِ عام میں "سیڑھیوں والا پُل" کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے دونوں جانب زینے پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف چڑھ کر دوسری طرف اُتر جانا پڑتا ہے۔ انھی زینوں کی وجہ سے تانگے موٹر اور بیل گاڑیوں کو اس پُل سے گزرنا مشکل ہے لیکن گائے بھینسوں اور کتّوں کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ وہ پٹ پٹا کر پار اُتر ہی جاتے ہیں

پُل کے شمالی رُخ کی سیڑھیاں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں لیکن جنوبی زینہ پتھر کی سلوں سے بنایا گیا تھا۔ ماضی بعید کا صیغہ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کی کہنہ سالی پہ میرے بزرگوں کی پختہ شہادتیں آج بھی موجود ہیں۔ مرورِ ایام اور کثرتِ استعمال کے باعث

پتھر کی یہ سلیں ضرورت سے زیادہ گھس گھس کر صاف و شفاف ہو گئی ہیں اور زینوں کے بیچوں بیچ ایک باضابطہ اور ہموار قسم کی ایسی ڈھلوان بن گئی ہے جسے آنکھیں بآسانی پا نہیں سکتیں اور بے خبری میں اکثر لوگ پھسل پڑتے ہیں۔ اگر کوئی برضا و رغبت پھسلنا چاہے تو اور بات ہے کیونکہ اس اقدام میں اچھی خاصی "سکیٹنگ" کا مزا رہتا ہے۔ مگر میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لوگ بے خبری میں اچانک پھسل جاتے ہیں۔ بے خبری کی نفسیات پر کوئی ترقی پسندانہ تحلیل یہاں مقصود نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ بیگم صاحبہ سے شکر رنجی یا دیگر خفیہ اور خانگی مجبوریوں کی وجہ سے جو لوگ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے گھر سے نکلتے ہیں وہ کسی قدر عجلت سے کام لیتے ہیں ایسے میں غیر متوازن قدم اُٹھانا اور اس کے نتیجے میں گر پڑنا غیر متوقع حادثہ نہیں ہے۔ ویسے بھی سیڑھیوں کے دائیں بائیں اور اُوپر نیچے اَن گنت بھک منگے قطار اندر قطار بیٹھے ہیں۔ سامنے سے کوئی گائے ابھرتی آتی ہے۔ اس کے عقب میں دو چار مزدور سائیکلیں اُٹھائے چلے آتے ہیں۔ لوگوں کا آنا جانا بھی لگا ہے چونکہ عالم تمام کا تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ ادھر اژدحام کا یہ حال اُدھر جذب تخیل کی وارفتگی۔ اس تصادم کا لازمی کرشمہ بے ساختہ اُفتاد کی صورت میں نکلتا ہے۔

خیر اتنا تو آپ جان گئے کہ اس پُل کی تعمیر پہ اک زمانہ گزرا

اور اس تعمیر کی علت غائی بھی آپ کو معلوم ہو گئی۔ تب سے اب تک اس پل کی آبادی اور شادابی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں کچھ کچھ تبدیلیاں اس کے حوالی میں ضرور ہوتی رہیں مثلاً ریلوے روڈ پر پل کی بغل میں آج کل جو ڈبہ نما دکانیں بن گئی ہیں۔ تقسیم سے پہلے ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اُن دنوں فضا کشادہ تھی۔ ریلوے لائن کے ساتھ پُل کے برابر جو بلند قامت دیوار کھڑی ہے اس کے دامن میں قُلفی کباڑی اور گداگر پہروں بیٹھے پائے جاتے۔ سردیاں ہوتیں تو کھُلی دھوپ میں دلچسپیاں کرتے دانتوں میں نسوار چبا جاتے اور تھوک کی پچکاریاں پھینکتے یا اپنے اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت کا جائزہ لگاتے جس میں بقول مرزا غالب بخیوں کے ٹانکوں کے سوا جوئیں پرورش پا رہی ہوتیں۔ کبھی کوئی دل شکستہ فراق دکھیارا گیت گاتا اور بنسری کی جوڑی بجاتا تو اس کے ساز میں سوز کی تلاش کرنے والے کئی لوگ جمع ہو جاتے۔ گرمیوں کی دوپہر میں شہتوت کی گھنی چھاؤں میں آرام کرتے۔ شام کے قریب کوئی سٹرک حکیم مجمع لگانے آ جاتا اور اپنے کارخانے کی شہرت کے لئے خاصی بیش قیمت دوائیں نہایت سستے داموں بیچ کر چلا جاتا ——— پل کے قرب و جوار کی حسین وادی کا یہ روزمرہ تھا جس کے التزام میں برسوں حرف نہیں آیا۔

یہ تو اس پُل کے پڑوس بلکہ زیر سایہ بسنے والی مخلوق کا تذکرہ تھا

لیکن اس پُل کا اصل سہاگ اور قدیم باشندے وہ ٹکڑ گدے ہیں جن میں آپ کو ہر نسل اور ہر عمر اور ہر صنف کے افراد ملیں گے، وہ بھی جن کا پیشہ سو پشت سے گداگری ہے اور ایسے بھی جن کو حالات کی گردش نے بیس کر یہاں لا بٹھایا ہے اور وہ بھی جنہوں نے اسی پُل پہ جنم لے کر دُنیا کی ہوا میں پہلی سانس لی تھی اور اب جن کے شعور کی کُل کائنات اور ہست و بود یہی پل ہے جس کے نیچے شب روز گاڑیاں دوڑتی ہیں اور اُوپر انسانیت رینگ رہی ہے۔ یہاں ایسے بھی ہیں جو قرآنِ مجید کی قرأت کو کشکولِ گدا بنائے بیٹھے ہیں اور وہ بھی جن کے گلے میں لوچ اور آواز میں رسیلے نغموں کی گونج پائی جاتی ہے۔ وہ بھی جن کو خُوئے سوال نہیں اور وہ بھی جو چیخ چلا کر سرمایہ فراہم کرتے اور بڑے ٹھاٹ سے بھنگ پیتے چرس اُڑاتے اور پاؤں پھیلا کر سو جاتے ہیں۔ وہ مادر زاد اندھے جنہوں نے ولادت سے اب تک آنکھ نہیں کھولی لیکن اُن کی بصیرت سخی اور بخیل کے پاؤں کی آہٹ کو پہچانتی ہے وہ بچے جنہیں ماضی نے اُچھالا اور مستقبل کے حوالے کر دیا۔ وہ نوخیز دخترانِ ملت جو گرمت کی قید سے آزاد ہیں لیکن نگاہِ ہوس میں اُن کی قیمت موجود ہے۔

اس انداز سے ہماری معاشرت کی قبائے رنگا رنگ کے ٹکڑے ٹوٹ کر پل کی وسعت میں ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ سندھی بلوچی - ملتانی - لاہوری پشاوری پہاڑی - پوٹھوہاری ملکہ ہر قبیلے

کے نمائندے اس اسمبلی میں جمع ہو گئے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک سپیکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف صدائیں اور رنگا رنگ لہجے طرح طرح کی بولیاں جب ٹِل کی دُنیا میں گونجتی ہیں تو عجیب سماں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب لینے کے ڈھنگ اور دینے والے کی نفسیات کے مطابق اپنے اپنے رنگ میں صدا کرتے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دم مارتا ہے۔ ان کے سینے بُغض اور کینے سے لبریز ہیں لیکن انسانی ہمدردی سے بھی عاری نہیں۔ ان میں جوشِ رقابت اور جذبۂ انتقام کی آتشِ فراواں بھی بھڑکتی ہے اور باہمدگر ایثار بھی کرتے ہیں۔ ان میں عشق بھی پلتا ہے اور ہوس بھی۔ یہ بھی اپنے اندھے ساتھیوں کی آنکھوں والی بیویوں کو گھورتے کھانستے اور پھانستے ہیں۔ یہیں نکاح بھی ہو جاتے ہیں اور طلاقیں بھی۔ میاں بیوی کے جھگڑے بہت دلچسپ ہوتے ہیں اور مہینوں چلتے ہیں۔ اس خلفشار میں بھک منگوں کے دو دو دھڑے بن جاتے ہیں۔ تجسّس و تکرار کا بازار گرم رہتا ہے۔ بالآخر کبھی ملاپ ہو جاتا ہے اور کبھی دو جسموں میں جدائی ہو کر کسی تیسرے گداگر کی آغوش آباد ہو جاتی ہے۔ یہاں بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جی ہاں بالکل اسی طرح جیسے گھر یا ہسپتال میں ہوا کرتے ہیں۔ کوئی متوقع رُوحِ انسانی ہمدردی کے دیپک جلا جاتی ہے قریب ہی سے کچھ عورتیں اُٹھ کر زچہ کو سنبھال لیتی ہیں۔ اگر بچہ

بے باپ کا نہ ہو تو مبارک باد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ریوڑیاں بھی تقسیم ہوتی ہیں اور خوشی کے شادیانے تو ریل کا انجن ہر وقت ہی بجاتا ہوا گزرتا ہے۔

کبھی کوئی گدا اگر بیمار ہو کر مر بھی جاتا ہے۔ تب ایک دو جگادہری بھک منگے حرکت میں آجاتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ دن عید سے کم نہیں ہوتا کیونکہ ع

اساں وسے گھر دی خیر کریں تے اکھاں دکھائیں مردہ
مویا گیا کچھ حاصل ہوسی تنے کی کردیسی ٹرہ دا

مُردے کو چارپائی پر پھیلا کر نمائش کرتے اور راہ گیروں سے چندہ وصول کرتے ہیں۔ اس پر جو دہرلوں میں لگا فضیحتی کے علاوہ جوتا بھی چل جاتا ہے۔ روپیہ کم بخت ایسی ہی شے ہے۔

پُل کے باشی — تازہ بتازہ نو بنو کھانے کھاتے ہیں اہلِ دُنیا پر جب کوئی ابتلا نازل ہوتی ہے تو پُل کی ہوا پلاؤ زردے کی بُو باس سے مہکنے لگتی ہے۔ کیونکہ مصائب کی ناؤ کو صدقہ اور خیرات کے چپو ہی سے پار لگایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ خیال نہ کیا جائے کہ گدا اگر صرف خیرات ہی کی آمد کے منتظر رہتے ہیں — نہیں بلکہ ان کے پاس زر و مال بھی ہے اور پُل کے اُس پار بھیر کلیجی کباب شربت اور گلے سڑے پھل گویا ہر چیز بکتی ہے — بہت سستے داموں یعنی ہر چیز ایک آنہ

پاؤ۔ جیسے کسی نے کنٹرول ریٹ مقرر کر رکھا ہو۔ خوانچے والوں کے پاس سکھوں کے زمانہ کے انار اور سیب آج بھی موجود ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ان بے بہا تحفوں کی قیمت وہی ایک آنہ پاؤ ہے۔ اگرچہ ایک آنہ پاؤ بڑا غریب پرور نرخ ہے لیکن پھر بھی گداگر گو کو بے مہری زمانہ سے شکایت ہے کہ پندرہ برس اُدھر یہ تمام نعمتیں ایک پیسہ پاؤ کے حساب سے ملا کرتی تھیں۔ کاش اُنہیں بین الاقوامی سیاست کا کچھ علم ہوتا۔ دُنیا بدل گئی اور بدلتی جا رہی ہے۔ معاشرت اور معیشت میں خوفناک انقلاب آ گئے۔ خاص طور پر وہ ہندو کہاں گئے جو تجارت کے واحد اجارہ دار تھے۔ ان کی جیبوں میں سنہری سکے کھنکتے اور وہ اس پل پر سے سرراٹ جوتیاں چٹخارتے رام رام کرتے گزرا کرتے اور بڑی ہی معنی خیز نگاہ سے اس اُمت کے افراد کو دیکھتے جو چندوں پر پلتی ہے۔ یعنی اسی نوعیت کے معنوی پلوں پر پُوری عمر بسر کر دیتی ہے ـــ لیکن خُدا کے لئے ان سے یہ نہ کہئے گا کہ پاکستان بنتے ہی ہندو یہاں سے بھاگ لئے تھے۔ کیونکہ ان سب کو اپنے مسلمان ہونے کے احساس کے باوجود اتنا تو پہلے بھی معلوم تھا کہ کوئی ہندو بھکاری کبھی اس پُل پر گداگری کرنے نہیں آتا تھا۔ مسلمان اور ہندو کی تفریق یوں بھی کسی گداگر کے لئے کیا ہو گی جبکہ ہندو مہاجن بھی دان پُن

کیلئے اسی پُل پر مٹھائی وغیرہ لایا کرتے تھے اور فقیر کی صدا سب کے لئے یکساں ہوتی ہے کہ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا۔

یہ صدائیں اور جوابی دعائیں اپنی جسامت اور ضخامت کے اعتبار سے خیرات کے قد و قامت کے مطابق ہوتی ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو خیرات وصول کرتے ہیں مگر دُعا نہیں کہتے۔ ان میں رعونت کبر و عُجب اور خلقی بدمزاجی پائی جاتی ہے۔ بھیک منگوں کا یہ برانڈ فلسفۂ خودی پر عامل ہے لیکن طریق گداگری کے خلاف اس مسلک میں انہیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ رہتا ہے۔

عوضِ خیرات اور جوابی دعاؤں کے فن میں جو گداگر مہارت رکھتے ہیں۔ انہیں گدایانِ متکبر کی بہ نسبت زیادہ بانت ہوتی ہے۔ ایک پنشنر جو آج کل اس پل پر مورچہ سنبھالے بیٹھا ہے کمال فن کار ہے جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا ــــ یہ اس کا تکیۂ دُعا ہے۔ اس کے دو جوان بیٹے بھی اس پل پر گداگری کرتے ہیں۔ بڑا لڑکا قیام پاکستان سے پہلے کہیں ملازمت کرتا تھا لیکن وہاں مشقت کرنا پڑتی تھی۔ اس نے سوچا والد ماجد سرکاری پنشن کے علاوہ چار پانچ روپے روزمیدا کر لیتے ہیں۔ اُس نے بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور نوکری سے رہائی پانے کے لئے اپنے بائیں ہاتھ کے نصف طولانی حصّہ کو ریلوے انجن کے نیچے رکھ کر قطع کر لیا

وہاں سے فارغ ہو کر باپ سے صدری علوم کی تکمیل کے بعد پُل پر آ بیٹھا ہے۔ گذشتہ عید الفطر کے دن ٹنڈ منڈ ہاتھ پر تازہ خون لگا کر بیٹھا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا شہیدوں میں نام لکھوانے کی ٹھانی ہے۔ کہنے لگا اس وقت ٹل جائیے شام کو بات کریں گے۔ آپ تو وقت بے وقت داستانیں لے بیٹھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے آج عید کا روز ہے۔ میں نے سوچا جان مارے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس لئے اپنی زبان چھید کر تازہ خون نکال کر یہاں لگا لیا ہے تاکہ جذامی کی مانند زخم ہرا بھرا نظر آئے۔

یہ تو مصنوعی زخموں کی کہانی ہے۔ کچھ گدا اگر قدرتی زخموں کا سہارا لے کر پروان چڑھتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کسی کے پاؤں میں ناسور ہو جائے تو وہ کوشش نہیں کرتا کہ مندمل ہو بلکہ اس کے ہم جلیس رشک کرتے ہیں کاش انہیں بھی یہی نعمت مل جائے راہ گیر ترس کھائیں اور آمدنی میں اضافہ ہو۔

جب ریل کے آنے جانے کا وقت ہوتا ہے تو پُل پر دو چند رونق ہو جاتی ہے۔ بیشتر اہل دل رک جاتے ہیں، اس وقت کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ انجن گاڑی سمیت فراٹے بھرتا ہوا نکل جاتا ہے اور تماشائیوں کی خاموش نگاہیں کہہ رہی ہوتی ہیں ؎

کتنے دل سینوں میں تڑپا تا ہوا جاتا ہے تو

جب ریل کا آخری ڈبہ پل کی حدود سے گزر جاتا ہے تو

تماشائی بھی اپنا رخ پلٹ لیتے ہیں اور منزلِ مقصود کی سمت جاتی ہوئی گاڑی پر نگاہِ واپسیں ڈالتے ہیں۔ جیسے ہیر کی ڈولی کھیڑے لئے جاتے ہیں اور رانجھے کے بھائی اس حسرت ناک منظر کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔

گاڑی نکل جانے پر ہجوم قدرے چھٹ جاتا ہے لیکن پوری طرح نہیں ٹلتا کیونکہ پُل پر منجن اور سرمہ فروش، نجومی اور جوہری بھی ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں۔ یہاں دن بھر خاصہ کاروبار رہتا ہے نجومی قسمت اقوامِ بدتنے کے لئے زائچہ ڈالتے اور نتیجہ نکالتے ہیں۔ تعویذ گر امتحان میں کامیابی اور قتل کے مقدمات سے بری کرانے تک کے تعویذ لکھتے ہیں۔ دوا فروش لوگوں کی آنکھ میں سرمہ لگاتے اور کبھی کبھی ایسی نورِ بصر عطا فرماتے ہیں جس سے اگرچہ بصارت نہ رہے پر دل ضرور روشن ہو جاتے۔ جوہری سچے نگوں کی انگشتریاں بیچتے ہیں۔ ان کے پاس یاقوت ومرجان کی ایسی ایسی انگوٹھیاں ہیں جنہیں پہن لیں تو سنگدل سے سنگدل معشوق زیر ہو جائے۔

دن بھر کا یہ ہنگامہ سورج ڈھلے تک برابر جاری رہتا ہے رات جوں جوں بھیگتی جاتی ہے۔ پُل پر اداسی چھانی جاتی ہے نجومی اور جوہری اپنی دوکانیں بڑھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

عرصہ ہوا جب پُل پر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی یہاں دنوں تمام گداگر عام اس سے کہ مجرد ہوں یا متاہل اسی پل پر دراز ہو جایا

کرتے تھے۔ اب بارش اور آندھی سے بچاؤ کی وہ صورت نہیں رہی ۔ پھر بھی بہت سے لوگ بختِ خفتہ کی طرح اسی جگہ لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ بارش اور آندھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ کوئی سی رُت ہو۔ ان کا کاروبار مندا نہیں پڑتا ۔ کیونکہ ان کی نیتیں پُرخلوص اور ان کے جذبے بے لاگ ہیں۔ انہیں اپنے فن سے لگاؤ ہی نہیں حقیقی عشق ہے۔ یہ اہلِ دنیا کی طرح ریا کا نہیں چھپ کر سازش نہیں کرتے۔ یہ مردہ سہی مردار نہیں ہیں، معاشرہ کے جاندار حصّہ سے کٹ کر بھی یہ لوگ مرکزِ ایمانی سے جُدا نہیں ہوتے۔ اسی لیے بآوازِ بلند قرأت کرتے اور نعتِ رسولؐ پڑھتے ہیں۔ یہ خود خفتہ ہیں لیکن اے کاش کوئی ان کا پیغام سُن کر بیدار ہو جائے۔ مدّت گزری یہاں ایک فقیر بڑے سوز و گداز سے شاہنامۂ اسلام پڑھا کرتا۔ جب کوئی تیز رفتار گاڑی گزرتی تو کچھ دیر کے لئے اس کا نغمہ پہیوں کے شور میں ڈوب جاتا تو میں سوچنے لگتا۔ یہ ایک پل ہے جو شہر کو صدر سے ملاتا ہے۔ اس کے نیچے ریل گاڑیاں دوڑتی پھرتی ہیں اور اس کے اُوپر ابنِ آدم رینگ رہا ہے اور اگر اگلا پُل بھی کچھ ایسا ہی ہوا تو شاید تمام بنی نوعِ انسان کو رینگنا پڑے گا کیونکہ وہ پُل بھی شرحِ صدر کو شہرِ خوباں سے ملاتا ہے۔

عید میلے

تہوار اب بھی اپنی اپنی رُت میں آتے اور نکل جاتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی صورت کیا سے کیا ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے ثقافت کا دھارا ہی یکسر بدل گیا۔ یا شاید قافلے کی راہوں میں نئے موڑ آ گئے۔ اب اگر دورِ ماضی سے حال کی شب برات کا تقابلی جائزہ لیں تو "براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو" کا گماں گزرتا ہے کیونکہ وہ پہلے کی سی ہا ؤ ہو اور ہما ہمی زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور دوسری دلچسپیوں کے سیلاب میں بہہ گئی۔ میں اُس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب شب چراغ زخموں کے دہانے خندۂ بے اختیار میں آپ سے آپ ڈھل جایا کرتے تھے۔ اور یہ تہوار پٹاخوں اور حلوے کے جلوے والی محض ایک رات

کی بات نہیں ہوتا تھا بلکہ پنڈی میں شب برات کا پورا ایک موسم ہوا کرتا۔ یہ رات انتہائی جوش خروش بلکہ دھوم دھام برا توں کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ اور اس کی آمد سے ہفتہ عشرہ پہلے پنڈی کا مطلع آتش آلود ہونے لگتا۔ گندھک اور پوٹاس کی بو باس سے فضا مہک اٹھتی۔ ادھر پٹاخوں کی خانہ ساز صنعت حرکت میں آتی اُدھر کوچہ و برزن میں اسٹالوں پر پھلجھڑیاں ریٹھے۔ انار ماہتابیاں اور پتنگے نمائش کے لئے لگا دیئے جاتے اور خرید و فروخت کا بازار گرم ہو جاتا۔

راجہ بازار سے لے کر بانسانوالہ بازار کی وسعت تک ان اسٹالوں کے علاوہ بہت سے پہاڑی تاجر بانسریاں بھی فروخت کی خاطر لایا کرتے اور فٹ پاتھ پر یہاں وہاں ہر سمت بانسریاں ہی بانسریاں پڑی ہوتیں۔ اُن کے نغمے ہوا میں تیرا کرتے۔ یہ ریڈیو اور لیپ اسٹک سے بہت پہلے کا افسانہ ہے جب رنگ کی جگہ آہنگ کی جنس بکا کرتی تھی۔ پہاڑی تاجر نفیری میں نغمہ و نالہ کا پیام اور فراقِ دمادم کی روح پھونکتے تو لوگ وجد میں آجاتے۔ شاید پیرِ رومی نے اس لمحۂ جدائی کے متعلق کہا ہوگا۔ ع

بشنو از نے چوں حکایت می کند

پنڈی میں یہ نفیریاں شب برات کا لازمی جز تھیں۔ اگرچہ

اس تہوار سے بانسری کا جو میل آجتک ہماری سمجھ میں نہیں آیا الا یہ کہ آتش بازی کے ساتھ راگ کی لاگ کو دیکھ کر ابوالاثر حفیظ نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "سوز و ساز" رکھ لیا ہوگا۔

راگ اور آگ کے ساتھ ساتھ "قصائی گلی" میں اس رات رامش و رنگ کی محفلیں بڑے زوروں کے ساتھ جما کرتیں۔ ویسے تو اس شہرہ آفاق گلی کی کوئی رات بھی بارات سے کم نہیں ہوتی لیکن جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ تب یہاں شب برات کی "خوشی" میں خاص الخاص جشن منائے جاتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ شب برات سے ٹھیک پندرہ روز بعد یکم رمضان سے عید کی چاند رات تک نغمہ و آہنگ کی یہ منڈی تقریباً سونی پڑی رہتی۔ مذہبی قدریں انحطاط کے اس عبرتناک دور میں بھی حدود و قیود کے بندی خانے سے آزاد نہ ہوئی تھیں۔ لوگوں کی رگوں میں خون ابھی سفید نہ ہوا تھا چنانچہ داد عیش دینے والے متوالے، خوف خدا نہ سہی بزرگوں کے ادب لحاظ کی وجہ سے رمضان کی آمد سے پہلے پہلے وہ سب کچھ کر گزرنا چاہتے تھے جس کی حسرت میں رمضان بھر انہیں مجبوری کی مشقت جھیلنا پڑتی۔

اسی رات حضرت شاہ چن چراغ رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پہ محفل سماع منعقد ہوا کرتی۔ یہاں بھی طوائفوں کا مجرا طلوع سحر تک جاری رہتا۔ جو لوگ قصائی گلی کے بالا خانوں کی بلندی

تک نہ پہنچ پاتے وہ یہاں ہجوم کرتے۔

آتش بازی کا ہنگامہ دن ڈھلتے ہی شروع ہو جاتا۔ محتاط قسم کے لوگ اپنے گھروں کے اندر پٹاخوں کی لڑیوں کو آنچ دکھا کر مٹی کے گھڑوں میں چھوڑ دیتے تاکہ کوئی چنگاری اُڑ کر کم سن بچوں کو لپیٹ نہ لے۔ لیکن عام گزرگاہوں اور بازاروں میں اس احتیاط کی چنداں ضرورت نہ سمجھی جاتی۔ خوش فکرے مسلمان بارودی دھٹوں کو آنچ دکھا کر ہوا میں لہرا دیتے۔ فضا کی تاریکی میں یہ دیکھتے شہاب بن کر ٹوٹتے اور دلکش سماں رہتا۔ کبھی کبھار کوئی ناہنجار دھٹا تیر کی مثال پرواز کرتا اور سنسناتی گولی کی طرح اڑ کر کسی کم نصیب کے گھر میں بچھے ہوئے بستر کے اندر آرام فرما لیتا اور چپکے چپکے اپنا جوہر دکھا جاتا۔ کمالِ جہاں تابی اصل میں اُس وقت نکھرتا جب کتوں کی دُم میں پٹاخوں کی لڑیاں باندھی جاتیں اور ٹاؤں ٹاؤں کے شورِ بے ہنگام میں آوارہ قہقہوں کی صدائیں آمیز ہو کر ہر طرف پھیلنے لگتیں۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے راجہ بازار چوک میں ایک ہندو نے پٹاخوں کا اسٹال لگایا۔ قریب ہی ایک مسلمان درزی کی دکان تھی اس کے بیٹے نے اسٹال سے دھیلے پیسے کی کوئی جنس خرید کی اور شوق کے ہاتھوں میں لے کر آرزو کی آنچ دکھائی اور امنگوں کی فضا میں لہرا دی۔ اتنے میں ہوا کا جھونکا اس شرر بار مٹی کو

وہیں لے آیا جہاں کا خمیر تھی یعنی وہ خستہ گا پھر سٹال پہ آگرا۔
اسٹال والا ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حسن کی چنگاری خرمن صبر و قرار کے کس گوشے میں گری ہے کہ کچھ مضطرب تمنائیں بھڑک اٹھیں اور آن کی آن میں پورا اسٹال گل انارہ کی مثال دہک اٹھا۔ اب ہندو اپنے نقصان مایہ کی تلافی کا طالب اور مسلمان تماشائی درزی بچے کی وکالت کرتے۔ ہندو مسلم فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تاہم مسلمانوں نے جوش و خروش کے ساتھ فیصلہ کیا کہ آئندہ شب برات پر وہ اپنے اسٹال لگائیں گے لیکن یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

شب برات گذر جاتی تو رمضان المبارک کا زمانہ آجاتا اُن دنوں محکمہ اطلاعات اور رویت ہلال کمیٹیوں کا وجود ابھی سراپردۂ امکان میں نہاں تھا۔ رسل و رسائل اور نشر و اشاعت کی وہ سہولتیں جو آج میسر ہیں اس دور میں کہاں تھیں۔ چنانچہ آغاز رمضان کی ابرآلود شامیں ایک آدھ روزہ کھا جانے کی گنجائش نکال دیتیں رمضان کو تو بہرحال آنا ہی ہوتا اور جب رمضان آدھمکتا تو بجھے ہوئے دیئے یکبارگی جل اُٹھتے۔ سحری کے ہنگامے جاگتے اور جگانے والوں کی ٹولیاں گشت کرنے لگتیں۔

رمضان کے ایام میں راتیں جاگتیں اور دن سویا کرتے قریب شام مساجد میں افطاریوں کی مارامار ہوتی۔ اب جس فیشن نے افطار پارٹی کے نام سے رواج پالیا ہے۔ اس زمانے میں یہ بات کم دیکھنے

میں آتی تھی۔ اکثر شرفا مسجدوں ہی میں افطار کرتے اور افطار کے لیے رنگا رنگ چیزیں ساتھ لے کر جاتے۔ افطار کے وقت گولے چھوٹتے۔ لاؤڈ سپیکر تو کہاں تھے ہاں اذان پڑھنے کی صدائیں قریب و دُور بقدرِ مقدور گونجا کرتیں۔ یا مسجدوں کے باہر چھوٹے بچے جمع رہتے جونہی روزہ کھلتا وہ افطار کا اعلان کرتے محلے کے طول و عرض میں گھوم جاتے۔

مسلمانوں کے ہوٹل دن بھر احتراماً بند رہتے۔ بند تو آجکل بھی رہا کرتے ہیں پر بیماروں مسافروں اور غیر مسلموں کے لئے مجبوراً کھولنے ہی پڑتے ہیں۔ اُن دنوں روزہ کھانے والوں کے لئے ہندوؤں کی دکانیں۔ چاٹ کے خوانچے مصروفِ کار رہتے کہیں کہیں مسلمانوں کے چھوٹے موٹے ہوٹل بھی چوری چھپے کا بیوپار کرتے پلتے جاتے۔ اور یہ اُن دنوں بڑے ہی دِل گردے کا کام تھا۔ اگرچہ قانونی اور اخلاقی گرفت جب بھی درمیان نہ تھی ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا جابر خوف اس شہر پر مسلط کر رکھا تھا اور وہ رئیس الاحرار مولوی محمد اسحٰق مانسہروی مرحوم کی ذات گرامی تھی۔ رمضان بھر شہر اور صدر میں اُن کی روزانہ گشت رہتی۔ وہ گھوڑے پر سوار نکلا کرتے۔ دو چار لٹھ مار خادم ہمراہ ہوتے۔ مولانا کسی ہوٹل پر چھاپہ مارتے اور بلائے ناگہانی کی صورت اندر داخل ہوکر کواڑ بند کر دیتے۔ طعام کھانے اور کھلانے والوں کی قرار واقعی

درگت بناتے۔ اس منظر کو دیکھ کر روزہ داروں کے بھی اوسان خطا ہو جاتے۔ مولانا بپھرے ہوئے شیر کی طرح دہاڑتے اور سالن کی دیگچیاں۔ چائے کی پتیلیاں نکال کر بیچ بازار اُلٹ دیتے۔ ہوٹل والوں کا منہ کالا کرتے۔ روزہ خوروں کو مرغا بناتے اور آخر کار توبہ کروا کے ٹلتے۔

اصل میں مولانا مرحوم کی ذات ایک پوری تحریک تھی۔ اُن کے جذبۂ جہاد اور جوشِ عمل کے بہت سے پہلو تھے۔ اُن کا نکلتا ہوا قد و قامت۔ سفید داڑھی۔ سر پر نیلے رنگ کی دستار۔ کھلی آستینوں کا قمیص اور کھدر کا تہہ بند آج بھی بعض لوگوں کے حافظے میں تازہ ہوگا۔ سب سے اہم ان کی باوقار شخصیت تھی۔ ایک رعب کہ بہت کم لوگوں میں دیکھا گیا ہے ان کی خاموشی میں ہیبت اور کلام میں دہشت کا اثر پایا جاتا تھا۔ وہ جہاں سے گزرتے لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ کیونکہ وہی اس شہر کے محبوب اور تنہا قائد تھے۔ دلوں پر اُن کا سکہ رواں تھا کوئی اُن کے آگے دم مار نہیں سکتا تھا۔ اور تو اور انگریز بہادر بھی اُن سے ڈرتا تھا کیونکہ مولانا قانون شکنی کو ——— بازیچۂ اطفال گردانتے تھے انہوں نے اپنی عمرِ طویل کا نصف اوّل فرنگی کی قید میں گزار کر بھی اپنی روش نہیں بدلی۔ اُن کے بدن کو پگھلے ہوئے تانبے سے داغا گیا اور انہیں آخر کار نشہرہ سے بلدر ہونے کا حکم دیا۔ جب سے انہوں

نے پنڈی کو مستقل مستقر بنا لیا اور یہیں مدت العمر قیام کے بعد اللہ کو پیارے ہوئے۔

وقت گزرتا گیا تو ایک روز یہ انکشاف ہوا کہ ایام پر مولانا کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی رہو یہ کہ ۲۷ء کی ایک دوپہر احترام رمضان کی مہم پر حسب معمول گھر سے نکلے۔ شہر میں گشت کے بعد صدر آ پہنچے چک بازار کی نکڑ پر منشی رجب علی جوہر کا ہوٹل تھا۔ اتفاق سے منشی صاحب کا بڑا بیٹا محمد شفیع افطار کی کسی تقریب کے لئے پکوان تیار کر رہا تھا۔ مولانا کے استفسار پر تکرار کی صورت پیدا ہوئی۔ اور شفیع کا لہجہ درشت ہو گیا۔ مولانا کو سان گمان بھی نہ تھا کہ کوئی مسلمان اُن کے جذبۂ خدمت کو یوں للکارے گا۔ اُن کا اپنا لہجہ تو فطرتاً تند و تلخ تھا ——————

—— گنبد میں برابر کی صدا اور مقابلے کی چوٹ دیکھ کر مولانا خاموشی کے ساتھ دکان سے اُترے اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس تشریف لے گئے۔ اس دن سے یہ مہم ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ مگر مولانا کیا خاموش ہوتے۔ اس بدنصیب شہر سے رمضان المبارک کے احترام کا تصور تک لوگوں کے دماغوں سے جاتا رہا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد اس احترام میں جو رخنے پڑے ہیں وہ آنے والے دور کے لئے عبرت کا سامان رکھتے ہیں اور یہ صورتِ حال اُس روایت کی موت ہے جس سے ہماری ملی حیات وابستہ تھی۔ یہ متاعِ کارواں کی بات

نہیں۔ احساسِ زیاں کے فقدان کا حادثہ ہے۔

رمضان کے بعد عید محکوماں ہجوم مومنین کا منظر کھل جاتا۔ بنی تالاب پر ایک میلہ لگتا جس میں مختصر پیمانے پر وہ سب دلچسپیاں ہوتیں جو آجکل لیاقت باغ کے میلے میں ہوتی ہیں۔ آس پاس کے دیہاتوں سے دہقان زادے سانجھ سویرے نکل پڑتے اور شہر پر یورش کرتے ایک پیسے کا پان دو پیسے کے پکوڑے اور مفت کے دھکے کھا کر قریب شام اپنے گھروں کو سدھار جاتے۔ ان میں غالب تعداد اُن قلاشوں کی ہوتی جن کے حال کی کیفیت ایک لطیفے میں بیان کی گئی ہے کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے میلے پہ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ اس نے کہا۔ چپکے بیٹھے رہو۔ ڈھلے کپڑے نہیں اور جیب میں مال نہیں میلے میں جا کر خاک پھانکیں گے۔ چھوٹے نے کہا بھیّا تو کیا ہوا چلو نا ہم وہاں جلیبی اور لڈو دیکھ کر لوٹ آئیں گے۔

محرم کے ایام کا جو نقشہ آپ آج دیکھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں نہیں تھا۔ رتہ امرال میں مجلس عزا منعقد ہوتی یا شہر میں محلہ امام باڑہ کے اندر عشرہ کی مجالس رہا کرتیں اور وہیں عشرہ کے دن ایک مختصر سا ماتمی جلوس نکل کر چوک تک آتا اور لوٹ جایا کرتا۔ تاہم صدر میں محرم کے ایام بڑے بارونق ہوا کرتے۔ ساتویں کی شب سے ٹکیوں کی نوحہ خواں ٹولیاں نکلتیں اور عشرہ کی دوپہر تک برابر نوحہ خوانی ہوا کرتی۔ تین چار تعزیے بھی اُٹھتے جن کے بنوانے میں بوہرہ برادری

کی مالی اعانت شامل ہوتی ۔ وفالیوں کا ایک کنبہ تعزیہ گری کا ماہر تھا اُن کے تعزیئے پانچ پانچ سات سات منزلہ ہوتے ۔ یہ بجلی کے تاروں اور کھمبوں سے پہلے کی بات ہے ۔ لوگ ان سر بفلک تعزیوں کو دیکھتے اور حیرت کرتے تھے ۔ چمن بازار سے ایک تعزیہ پیتل کا بنا ہوا بھی نکلتا رہا ۔ عاشورے کی تمام رات نوحہ خوانی رہتی ۔ ٹولیاں لمبے لمبے عَلَم اُٹھا کر نکلتیں ان میں ہر سن و سال کا آدمی ننگے پاؤں ہوتا ۔ اعوذ و تسمیہ کے بعد ایک شخص نوحہ آغاز کرتا اور ہر مصرعہ کے اختتام پر دوسرے لوگ یا حسینؑ پکارتے ۔ نصف شب کے ہنگام تعزیئے سڑکوں پر لائے جاتے جن کے آگے آگے مرثیہ خواں ہوتے ۔ تعزیوں کے عقب میں گتکہ بازوں کے دستے روانہ ہوتے ۔ دُور دُور تک مشعلیں ڈھول اور تاشے نظر آتے ۔ ماہر فن اکھاڑے میں اُترتے اور ایسا کمال دکھاتے کہ مجمع دم بخود رہ جاتا ۔ سڑک پر خاصہ ہجوم ہوتا ۔ مکانوں کے چھجوں اور چھتوں پر مستورات اور بچے جمع ہوتے ۔ فجر کے قریب تعزیئے واپس اپنے مقام پر لا کر رکھ دیئے جاتے ۔ نوحہ خواں گھروں کو چلے جاتے اور گتکے باز منتشر ہو جاتے ۔

پھر دوپہر کے وقت عاشورہ کا جلوس چوک میلاد سے شروع ہوتا ۔ بازار میں ہر طرف شربت کی سبیلیں لگ جاتیں ۔ کیوڑے اور گلاب کی خوشبو سے سارا صدر بازار مہک اُٹھتا ۔ کبھی کبھی عقیدتمند ہندو بھی شربت کی سبیلیں لگاتے تھے ۔ تعزیوں کے ساتھ مرثیہ خواں

ہوتے اور شہیدیاں پڑھی جاتیں۔ لوگ اشکبار ساتھ ساتھ چلتے آگے آگے وہی گتکہ بازوں کے دستے اپنا کمال دکھاتے۔ گتکہ بازوں کے یہ اکھاڑے سال سال بھر مشق کرنے کے بعد عاشورہ کے روز اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے۔ ان سب میں استاد ننھّے خاں کا اکھاڑہ بہت مشہور تھا۔ اس کی شہرت کو دیکھ کر دوسرے ماہرِ فن بھی محنت کرتے اور مسابقت کی دوڑ میں بازی لے جانے کے لئے شبانہ روز مصروف رہتے تھے، ہر اکھاڑے کا اپنا اپنا علم ہوتا مقابلے کے اندر جو شخص جیت جاتا۔ عَلَم اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پنڈی میں بسنے والے چوہڑے چمار دو نے بھی لاتعداد اکھاڑے بنا رکھے تھے۔ لیکن شاید ہی اس طائفے سے کبھی کوئی باکمال اٹھا ہو۔ اصل میں اہلِ فن ان کو نیچ جان کر گُر کی بات نہیں بتاتے تھے۔ اس لئے ان کے اکھاڑے محض اچھل کود اور سپاٹ قسم کی بنّوٹ کا ادنیٰ نمونہ تھے۔

عصر کے قریب تعزیوں کا یہ جلوس ولیسٹرج کے جدید قبرستان میں پہنچ کر ختم تو نہ ہوتا بلکہ ایک میلے کی شکل اختیار کر لیتا جس میں کھیل تماشے۔ جادو کے کرشمے زندہ ناچ اور گانے ہوتے۔ محرم کے دن میلے کی یہ شکل آج بھی اسی مقام پر اسی انداز سے باقی ہے۔

عید میلاد کے دنوں میں چالیس برس پہلے صرف نذر نیاز اور میلاد شریف کی مخصوص محفلوں کا رواج تھا۔ عوام الناس میں یہ دن "بارہ وفات" کے نام سے مشہور تھا۔ رفتہ رفتہ اس دن کو منانے کے لئے وسیع اجتماعات منعقد ہونے لگے جن میں سیرت النبیؐ سے زیادہ سیاسی اور ملکی مسائل بیان کئے جاتے۔ یہ صورت ایک مدت تک قائم رہی —— پھر اس دن کی تقریبات میں ایک جلوس کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔

اس عظیم الشان جلوس کی ابتدا ایک تاریخی حادثہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس حادثے نے سیاستِ وقت کی گود میں آنکھیں کھولیں اور حالات نے اسے پروان چڑھایا۔

جلوس کی ابتدا یوں ہوئی کہ منڈی شہر میں ہندو سکھ اور مسلمان تین بڑی قومیں آباد تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی دفاتر میں عملداری تھی، اور منڈیوں پر بھی وہی قابض تھے۔ ان کی معاشی بالادستی مسلمانوں پر حکمرانی کر رہی تھی۔ ان کی عبادت گاہوں سے گجردم گھڑیال اور گھنٹوں کی صدائیں۔ ناقوس کے نالے۔ گھنگھروں کے چھناکے اور طبلوں کی دھمک تھپک ابھرتی اور فضا میں دور دور تک پھیل جایا کرتی۔ سازوں کے آہنگ پر پونر دیو داسیاں گیت گاتیں اور ان گیتوں کی لے پر عبادت کا کیف انگڑائی لیتا۔ راگ رنگ کی یہ کیفیت محض مندروں اور گوردواروں کی چار دیواری تک محدود نہ

بھتی بلکہ سال میں کئی کئی بار نگر کیرتن ہوتے جن میں گلی گلی بیراگی بھجن گاتے پھرتے۔ (راگی)

شہر کی فرقہ وارانہ تلخی کا موجب ہندو سکھوں کے یہی نگر کیرتن تھے۔ جامع مسجد کے سامنے سے گاتے بجاتے نکلنا مسلمانوں کے صبر و سکوں کو للکارنے کے مترادف سمجھا گیا۔ رفتہ رفتہ تلخیوں کی ننھی سی آنچ ایک روز بھڑک کر الاؤ بن گئی اور باہمی نفرت کی خلیج اتنی وسیع ہوئی کہ مئی ۲۶ء کی ایک قیامت بدوش رات شہر میں قتل و غارت اور آتش زنی کی مہیب وارداتوں کو اپنے جلو میں لے کر آ گئی۔ کئی روز سے فضا مکدر تھی اس روز راجہ بازار کے گوردوارے میں شام ہی سے سکھوں کے جتھے ہتھیار سجا کر جمع ہو گئے۔ ہندو اپنی جگہ سوڈا واٹر کی بوتلیں اور تیزاب کے کنستر لے کر بیٹھ گئے۔ اُدھر مسلمان بھی خدا کا نام لے کر تیاری کرنے لگے۔ محلہ ورکشاپی میں مضافات کے لٹھ مار اور خنجر بکف مسلمان خاصی تعداد میں آ گئے۔ جونہی سورج غروب ہوا سکھوں نے حملے شروع کر دیئے اور جوں جوں تاریکی بڑھتی گئی قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تھڑوں پر سونے والے مزدور پیشہ مسلمان جنہیں شہر میں ہندو مسلم کشیدگی کا علم و شعور تک نہ تھا بے گناہ قتل کر دئیے گئے۔ اب مسلمانوں نے جوابی حملہ شروع کیا اور گنج منڈی پر دھاوا بول دیا۔ آس پاس کے گھروں سے ہندو سکھوں نے تابڑ توڑ گولیاں برسانا شروع کیں لیکن

مسلمان گنج منڈی کے قلب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور عمارتوں کو آگ دکھا دی۔ بہت سی دکانیں اور مکان عشق کی آگ میں بقعۂ نور بننے لگے۔ تمناؤں کی دھیمی دھیمی آنچ کو سلگتے عمریں بیت جاتی ہیں لیکن قلب حزیں کی چار دیواری میں کوئی شمع نہیں جگمگاتی مگر حُسن کے ایوان میں کرنِ شب تاب کی ہلکی سی کرن بھی لہرا جائے تو شعلوں کی زبانیں ہر طرف لپکنے لگتی ہیں اور متاعِ جان و جگر کو راکھ بنا کر اڑا لے جاتی ہیں۔ پھل منڈی میں ایک جگہ حقیقت افروز بورڈ لٹک رہا تھا جس پر تحریر تھا "سورج مارکہ مٹی کا تیل رات کو دن بناتا ہے"۔ — لوگوں نے رات کے دن پھرتے نہ دیکھے تھے۔ کیونکہ تیرہ بختوں کی سیاہ راتوں میں طلوع سحر کا جلوہ ہی مدت سے نہ بکھرا تھا۔ جب اس جوالامکھی میں آگ بھڑکی تو نور کا سیلِ رواں زمین سے آسمان تک مسلسل اُٹھتا نظر آیا۔

گنج منڈی رات بھر عشق و مستی کی تند و تیز بھٹی میں پھنکتی رہی۔ شہر کے دوسرے حصوں میں سوڈے کی بوتلیں اور تیزاب کی پچکاریاں چلتی رہیں۔ اگرچہ یہ محض ایک رات کا کھیل تھا۔ رات کو دن بنانے والی روشنی تو نور کے تڑکے بجھ گئی لیکن نفرت کی سرد نہ ہونے والی آنچ اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

اس المیہ کے بعد جس میں مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ ضلع کے اعلیٰ فرنگی حکام نے میزان کے دونوں پلڑوں کو ہم وزن کرنے

کے لئے شہر کے مقتدر مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ نگر کیرتن کے مقابل کوئی جلوس مقرر کریں۔ یہ تجویز معقول تھی اور وقت کا تقاضہ بھی کچھ ایسا تھا چنانچہ اگلے برس عید میلاد کا جلوس نکلا اور اس شان سے نکلا کہ دشمنوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

ابتداء میں بعض حلقوں سے اس جلوس کے خلاف صدائیں بھی بلند ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" میں اداریہ لکھا کہ یہ فعل سراسر بدعت ہے اور مذہب کی رُوح کو لہو و لعب میں بدلنے کی شعوری کوشش ہے۔ اس کے جواب میں عقیدے والے مسلمان کہتے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات۔ اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔ جب نیت میں میلادالنبیؐ کی تقریب سعید پر اظہارِ مسرت مقصود ہے تو لہو و لعب کیسے ہوا اور نعت خوانی بدعت کیوں ہونے لگی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں حضرت حسان بن ثابتؓ سے اپنی مدح سنی تھی ــــــ تاریخ دان طبقہ ہجرت کے موقعہ پر قبا سے مدینہ کی روانگی کا حوالہ دیتا۔ جب انصارِ مدینہ سرکار دو عالمؐ کو جھرمٹ میں لے کر چلے تھے۔ یہ جلوس نہیں تھا تو کیا تھا۔ بہر کیف جلوس نکلتا رہا اور اب تک نکلتا ہے۔ ہوتے ہوتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں عید میلاد کے جلوس نکلنے لگے۔ لیکن پنڈی کو یہ فخر ہمیشہ حاصل رہے گا کہ اس جلوس کی ابتدا اسی شہر سے ہوئی۔

جادوئے بنگالہ

مارچ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے پنجاب کو سکھا شاہی سے نجات دلا کر اپنی قلمرو میں شامل کیا اور پنڈی کو علاقائی حیثیت کی وجہ سے ناردرن کمانڈ کا صدر مقام بنایا تو دوسرے بے شمار دفاتر کی طرح حسابات فوج کا بھی ایک دفتر یہاں کھول دیا۔

اس دفتر کی عالی شان دو منزلہ عمارت "میکسن روڈ" کے چوک میں اُلٹے ہاتھ کو واقع ہے جس کی تعمیر میں اس کے معماروں کا حُسنِ ذوق جھلکتا ہے۔ سقف، بام و در اور محرابوں پر اچھے خاصے گرجا گھر کا گمان ہوتا ہے۔ دفتر کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک باغیچہ ہے جس کے کہن سال درختوں کی گھنی چھاؤں دورِ ماضی کا دلکش افسانہ کہہ رہی ہے۔ روش روش کنج کنج ڈالی ڈالی رنگا رنگ پھولوں کا ڈھیر ہے

بادِ سحر کے سُبک جھونکوں کے درمیان نرم و نازک کلیاں ٹکتی مٹکتی جھٹکتی اور آپ سے آپ چٹک جاتی ہیں۔ اس گلشن بداماں فضا کے پس منظر میں دفتر کی بلند و بالا عمارت دلہن کی طرح غرور میں سر اٹھائے کھڑی ہے اور اس کا غرور بے جا بھی نہیں کیونکہ علاقے بھر میں اس سے زیادہ دلکش عمارت موجود تھی اور نہ ہے۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں اس عمارت کی بُنیادیں اُستوار ہوئیں۔ دیواریں اُٹھیں تو دفتر کے مکیں بھی آ گئے۔ آئے نہیں لائے گئے۔ میرا اشارہ ہندو بنگالی بابوؤں کی طرف ہے۔ اصل میں وہ بنگلہ بابوہی کا دور تھا۔ بیڑی تمباکو کے یہ رسیا اپنے دھواں دھواں سے چہروں کے ساتھ عشق پیچاں کی مانند سرکارِ برطانیہ کے تمام دفتروں پر چھائے ہوئے تھے۔ اُتر پچھم دکن اور پُورب کا ہر قریہ اُن کی سیرگاہ بنا ہوا تھا۔ ہُگلی کی گود سے اُٹھ کر یہ سوکھے ساکھے بابو لوگ اقصائے ملک تک ہر اُس جگہ پہنچ جاتے جہاں ریل گاڑی اُنہیں لے جا سکتی۔ چنانچہ حساباتِ فوج کے دفتر کی پہلی کھیپ بھی بنگال ہی سے آئی۔ یہ لوگ اتنی تعداد میں آئے کہ اُن کی وجہ سے ملٹری اکاؤنٹس آفس کا نام "کلکتہ دفتر" پڑ گیا اور زبانوں پر ایسا چڑھا کہ آج تک نہیں اُترا۔

بنگالی ہندوؤں کا یہ دَور ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد تک تقریباً باقی تھا۔ یہ دَور بڑا عجیب اور عبرت ناک حد تک دلچسپ ہے۔ سرکارِ

برطانیہ کی دفتری ضروریات کے پیشِ نظر یہ دفتر بنگلہ بابو کی خانگی جاگیر بن گیا تھا۔ اگرچہ اس حادثے کو حُسنِ اتفاق سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہئیے۔ تاہم یہ امرِ واقعہ ہے کہ تقریباً نصف صدی تک بنگال کی مائیں بچوں کی ولادت پہ اُن کے کانوں میں یہ جادو پھونک دیا کرتیں کہ بیٹا میٹرک پاس کر لیجو تو کلکتہ دفتر پہنچ جائیو۔

بنگلہ بابو ہندو ہونے کے باوجود سہل انگار اور آرام پسند مخلوق تھے۔ صبح دم دفتر پہنچتے ہی پہلے تازہ خبروں پر تبصرہ کرتے۔ پھر گڑگڑیاں اور بیڑیاں سلگا کر دھواں اُڑاتے۔ زاں بعد کمرہ در کمرہ گھوم جاتے۔ یار احباب سے بنگال کا حال احوال دریافت کرتے۔ سیاست خولیا کے کارن انگریز کو دل کی آنکھ سے یوں دیکھتے جیسے کانی بھینس قصائی کو دیکھتی ہے۔ اُوپر اُوپر نظم و ضبط برقرار رکھتے۔ اندر اندر آگ سلگتی لیکن اس سے بحث نہیں کہ کام کر کے نہیں دیتے تھے اور بیکار وقت ضائع کرتے، ان کا کردار ڈسپلن کا بڑا پابند تھا۔ اس پابندی کی وجہ اُس زمانے کی مجبوریاں تھیں کیونکہ فضا کسی فوری انقلاب کے لئے ہموار نہ تھی۔

ٹفن کے وقفے میں مچھلی اور بھات کی چکھوتی کر کے اپنی بنگالی بھڈگارتے اور کچھ دیر کو ٹانگیں پسار کر آرام کرتے۔ اسی ادھیڑ بن میں تین اور چار بجے کا عمل ہو جاتا۔ اب میزوں پر بے تحاشہ کاغذات پھیلا دیے جاتے۔ ہر سمت ہمہ تن انہماک، خاموشی اور صریرِ خامہ

نوائے سروش کا منظر کھل جاتا۔ یہاں منتی کا یہ سوانگ اس لئے رچایا جاتا کہ اُن دنوں کبھی کبھی چھٹی سے قبل انگریز کنٹرولر آنکلتا تھا وہ دیکھتا کہ بابو لوگ سرتا سر کام میں گڑے پڑے ہیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔ یہ انہماک اس بات کا اشارہ ہوتا کہ روز تپ سے بخار رہتا ہے۔

انگریز اپنی فطرت سے اِنسان پرور واقع ہوا تھا۔ وہ سمجھتا بچارے کام کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ چنانچہ مزید عملے کی بھرتی کا فوری حکم صادر کرتا اور اگلے ہی دن کئی ہندو مگر بنگالی امیدوار اس ... دفتر میں بھرتی کر لئے جاتے۔ کنبہ پروری اور نسلی تعصب کی ایسی بھیانک مثال متحدہ ہندوستان میں کہیں اور پائی نہ جاتی تھی۔ اور تو اور مقامی ہندو اور سکھوں کے لئے بھی اس دفتر کی جنت کا دروازہ کھولا نہ جاتا تھا۔ بنگالی اپنے افسرانِ بالا کو یہ باور کرانے میں بڑے ہوشیار تھے کہ شہر میں خواندہ نوجوان قطعی مفقود ہیں۔ اس لئے باہر مجبوری صرف بنگالی ہی بھرتی کیئے جاتے ہیں۔ انگریز کو بھی اس سے فکر نہ تھی کہ "گاؤ" آئے یا "خر"۔۔۔ اس کے نزدیک سگِ بد برادرِ شغال کا حکم رکھتا تھا۔

لطیفے کی سی بات ہے کہ ان ستم ظریفوں نے ایک اندھے بنگالی کو بھی فیضانِ معیشت کے اس کے سرچشمے سے سیراب ہونے کے لئے بھرتی کر رکھا تھا۔ یہ مادر زاد اندھا صبح آتا اور شام چلا جاتا تھا گویا دفتر ہی کے کام آتا تھا اور رقم کو طلب بدستور پاتا تھا۔ کبھی

برس اس رنگ سے گزر گئے۔ ایک دن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سیڑھیوں میں انگریز کنٹرولر سے اس کی ٹکر ہو گئی۔ کنٹرولر نے دیکھا ایک بنگالی سیاہ چشمہ لگائے اندھوں کی صورت پاؤں پاؤں چلتا آیا اور بے محابا ٹکرا کر رہ گیا ہے۔

پوچھا "کیا تم اندھے ہو؟"

جواب —— ندارد —— !

القصہ کنٹرولر نے ملاحظۂ چشم کے لئے ملٹری ہسپتال بھجوایا۔ ڈاکٹر نے رپورٹ کی کہ خدا کے فضل سے مکمل اندھا ہے۔ ناچار ملازمت سے برطرف کیا گیا —— لیکن مولائے کریم بڑا بے نیاز ہے

ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں میں خفا

کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

کچھ دنوں میں وہ انگریز کنٹرولر تبدیل ہو کر چلا گیا تو بنگلہ بابوؤں نے ڈاکٹروں سے مل ملا کر اس "کے سی ڈے" کو پھر ملازم رکھوا دیا۔ اس خوش بخت کو وقفۂ برطرفی کی پوری تنخواہ بھی دی گئی اور آخر کار پنشن پا کر ہی یہاں سے نکلا۔

بنگالی بابو تمام کے تمام بابو محلہ صدر میں آباد تھے۔ چنانچہ اس محلے کی کیفیت بھی کلکتہ دفتر کی طرح اُنہی کے نام پہ بابو محلہ قرار پا گئی۔ اس محلہ کے دو رویہ مکانات بنگالی موسیقی کے ساز و آہنگ سے معمور رہا کرتے۔ بالخصوص منڈی میں کالی باڑی مندر بھی انہوں نے قائم کر رکھا

تھا۔ مندر میں ایک چبوترے پر کالی ماتا کا بُت دھرا تھا۔ بنگالی اپنے عقیدے کے مطابق یہاں سیس نواتے تھے۔ کبھی کبھی بھینٹ چڑھانے کے لئے بکرے بھی لائے جاتے۔ بابو محلہ سے بنگالنیں گاتی بجاتی جلوس کی شکل میں برآمد ہوتیں اور کالی باڑی مندر پہنچ کر کچھ رسومات ادا کرنے کے بعد بکرے کا جھٹکا کر کے اس کا خون آلود سر کالی ماتا کے چرنوں میں رکھا جاتا۔ اسی مندر میں ایک ہال تھا جس میں ہفتے کی رات ناٹک تماشے ہوا کرتے۔ یہ ضرب المثل غلط نہیں کہ بات سن بنگالی کی بنگالنوں کے بال دیکھ۔ ان ناٹکوں میں جن آنکھ والوں نے نصف صدی پہلے زلفِ سرتا بہ کمر کا منظر دیکھا ہے وہ اب بھی امڈتی گھٹاؤں کا ذکر کرتے پائے جاتے ہیں۔

بات موضوع سے ہٹ کر زلفِ دراز میں اُلجھی جارہی ہے۔ میں آپ سے کلکتہ دفتر کی کہانی کہہ رہا تھا۔ مدّت تک ہندو بنگالی نے اپنی خلیج بنگالہ میں اور کوئی لہر شامل ہونے نہیں دی۔ لیکن پنجاب کا ہندو بھی آخر ہندو تھا اور جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی۔ ڈمرے جیلے بہانوں سے شرمان لوگ اس دفتر کے چور دروازوں سے گزر کر داخل ہونے شروع ہوئے۔ پہلے اِکّا دُکّا پھر جتھہ در جتھہ اور آخر میں یہ حالت ہو گئی کہ ان تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل نے کمال مستعدی سے دو دو چار بنگالیوں کا کام سنبھال لیا۔ چغل خوری اور بنیائی ہٹ مار سے انہوں نے جا دیئے بنگالہ کو توڑ

کر رکھ دیا۔ ؏

ویدجی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہی خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

اس نئی کھیپ میں جاہل اور پڑھے لکھے دانا اور بینا تندرست اور بیمار ہر کردار کے مہاشے شامل تھے۔ کنبہ پروری اور عصبیت ان کی بھی ہر رشت میں داخل تھی۔ اُن کے آتے ہی بنگالیوں کو بھاگتے بن آئی۔ کچھ یہاں سے تبادلہ لے کر میرٹھ اور پونا گئے۔ کچھ قبل از وقت پنشن پا کر چلتے بنے۔ اس طرح چند برس میں بنگالی دادا کے وجود سے کلکتہ دفتر اور بابو محلہ دونوں صاف ہو گئے۔

اب گوکل کے بن میں شام مراری کی مرلیا بجنے لگی۔ تنخواہ کا ابتدائی سکیل چونکہ بقیہ تمام دفاتر کی بہ نسبت معقول تھا۔ اس لیے ہندو بچے یہاں ملازمت کے آرزو مند رہا کرتے جس پکوڑی مل کا بیٹا نوکر ہو جاتا اس کے گھر میں "ودھایاں" دینے والوں کا ہجوم ہو جاتا اور لگے ہاتھوں "سگایاں" بھی طے پا جاتیں اور دیکھتے دیکھتے شہنائیوں کے راگ میں سہاگ راتوں کے سندر اور منوہر گیت جاگ اُٹھتے۔

اس میں کلام نہیں کہ مہاشہ کلرکوں کی یہ تازہ کھیپ بڑی کامیاب رہی۔ یہ لوگ دفتری اوقات کے علاوہ بھی دفتری کام ہی کرتے۔ گھر پہ فائلیں ساتھ لے جاتے۔ اُن کی ذہنیت کچھ

ایسی کلکتہ دفتری قسم کی ہوگئی تھی کہ ہر شخص کی زبان پر نہ ختم ہونے والی داستان یا ستان رہتی۔ یعنی وہ غبن پکڑا۔ اُس افسر کی توہین کی۔ فلاں اداٸیگی روک لی۔ ایم ای ایس کے فلاں کلرک نے اتنے ہزار کمائے اور مکانات بنوائے وغیرہ وغیرہ۔

اگر ریل گاڑی میں کبھی اس دفتر کے دو کلرک اتفاقاً آپ کے ہم سفر ہو لیے تو منزل تک دفتری کاتیں کے سوا کوئی گفتنی ان کے موضوع سے خارج سمجھیے۔ ان کا مزاج۔ ان کی لطیفہ گوئی۔ ان کا مرنا جینا سب کچھ دفتری اصطلاحوں تک محدود ہوتا۔ کسی بیمار کلرک سے پوچھئے تو کہے گا۔ ویسے میں بارہ آنہ آرام ہے گویا حساب لکھتے لکھتے اکاؤنٹس کے جراثیم ان کی رگوں میں رچ بس جاتے۔ کثرتِ کار اور مسلسل ناہموار یکسانی کی وجہ سے جو اُن کی فطرت میں پیوست ہوگئی تھی۔ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کوئی اہم کردار ادا کرنے سے قاصر رہتے۔ حتیٰ کہ بیویاں تک اُن سے شاکی رہا کرتیں۔

—— یہ بات مجمع عام میں کہنے کی نہیں ہے کہ میونسپلٹی کا کوئی اہل کار کسی کلکتہ دفتری بابو کے گھر گیا۔ دستک دینے پر معلوم ہوا کہ شوہر کہیں گیا ہے۔ اس اہل کار نے کہا کسی بچے کو باہر بھجوا دیجئے واٹر ٹیکس سے متعلق ایک مسئلہ دریافت طلب ہے۔ اندر سے آواز آئی۔ بھائی ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے۔ میاں کلکتہ دفتر میں ملازم

ہے۔ بچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے ایک سکھ دوست نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ قصہ سنایا تھا کہ تیلی محلے کے آس پاس کسی گلی میں ایک کنواں تھا جس کے گرداگرد مختصر سی چار دیواری تھی۔ یہاں دیویاں اور شری متیاں اشنان کرنے آتیں۔ ایک صبح کوئی کلرک بکار سرکار گھر سے نکلا اور اس کنواں تک آکر بے خیالی میں رک گیا (شاید دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ہوگا) دیویاں برہم ہوگئیں کہ بھڑوا نیم عریاں عورتوں کو گھورتا ہے اتنے میں کسی عورت نے پہچان کر کہا ـــ جانے امن ہے نہ کہ مقام خوف۔ یہ بے ضرر انسان کلکتہ دفتر کا بابو ہے۔

کنبہ پروری کی بدولت بعض ان پڑھ قسم کے لوگ بھی بھرتی ہو گئے تھے اور یہ کام "سنگت" کا تھا کہ انہیں "چلائے"۔ ایک ایسا ہی بزرگ "شیڈول سیکشن" میں مدت العمر رہا۔ اس شعبے کے متعلق صرف اتنا کام تھا کہ کاغذوں کے پلندے میمو کے ساتھ منسلک کرکے متعلقہ دفاتر کو بھیجے جاتے تھے جس کے مقررہ الفاظ یہ تھے "حاشیہ میں مندرج کاغذات منسلک ہیں مناسب کارروائی کی جائے۔" وہ عظیم الشان کلرک اس سدا بہار ڈرافٹ کا اتنا ماہر ہوگیا تھا کہ اس نے نجی خط وکتابت بھی اسی نہج پر لکھنے کی مشق کما حقہ بہم پہنچالی تھی۔ کہتے ہیں اُسے بواسیر کا عارضہ تھا۔ ایک روز رخصت کی عرضی میں لکھا۔ بندہ حاشیہ میں مندرج بیماری کی وجہ سے

دفتر نہیں آسکتا۔ رخصت مرحمت فرمائی جائے اور حاشیہ میں ایک دائرہ کھینچ کر عین وسط میں سُرخ روشنائی سے نقطہ لگایا تاکہ بیماری کی شناخت ہو سکے۔

مندروں میں پنڈت اور گوسوامی اپنے ویاکھیانوں میں آئے دن یہ کہتے پائے جاتے کہ بھرا تاجی کلکتہ دفتر میں دس آسامیاں خالی ہیں کوئی اپنا مِتّر ہو تو بھیجو۔ کہیں "موسلے" ملازمت حاصل نہ کر لیں۔

لیکن وقت جوں جوں گزرتا گیا اور مسلمان مروجہ تعلیم سے بہرہ مند ہوتے گئے۔ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے دفتروں میں پہنچنے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ بعض سیاسی جماعتوں نے حکومت سے مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کا تقاضا کیا اور دفاتر میں اُن کے لئے آسامیاں مخصوص کر دی گئیں۔ ہندو نے محسوس کیا ہے

بہت دنوں کا سویا منوا

جاگت جاگت جاگا ہے

اس طرح مسلمان بھی دھیرے دھیرے سرکاری آٹے کے اندر نمک کی مقدار میں شامل ہونے لگے۔ یہ مخلوط ہندو مسلم تمدن بڑا پرلطف تھا۔ مسلمان کُھری اقلیت میں تھے۔ پریس ان کی مدد پر تھا اور سیاسی پلیٹ فارم اُن کے تحفظ کی خاطر ہر آن مستعد رہتا۔ اس لئے مسلمان کسی ادنیٰ سی بے انصافی کو بھی برداشت نہ کرتے۔ ملک بھر میں شور مچ جاتا۔ ان حالات میں ہندو بڑی

رازداری سے شب خون مارتا اگرچہ اس کی بے بسی اور پسپائی کا منظر بھی دیدنی ہوا کرتا۔

ہندو یہ تو جانتا تھا کہ مسلمانوں کی جماعتی تنظیم سرے سے مفقود ہے۔ ہاں مگر سرکاری دفتروں میں ان کی جذباتی تنظیمیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوصف ہندو کوئی موقعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا کیونکہ ع

مقتضائے طبیعتش ایں است

لیکن یہ داستان صرف کلکتہ دفتر تک محدود نہ تھی۔ سارا ملک اس کی زد میں تھا۔ مجھے یاد ہے قیام پاکستان کے وقت جناب شجاعت علی صدیقی ایم اے جی نے مسلمان عملے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ”ایک زمانہ تھا جب مسلمان کلرکوں کو اس محکمے میں جور و ستم کا نشانہ بنایا جاتا اور اُن کو ”بدھو“ کے لقب سے پکارا جاتا لیکن آج حالات بدل گئے۔ تقسیم کے ضمن میں دہلی کے اندر جو کام ہو رہا ہے۔ اس سے مسلمانوں کے جوش و خروش کا پتہ چلتا ہے آئندہ توقع ہے کہ اس محکمے کی روایات ہندوؤں کے بعد بھی بدستور قائم رہیں گی۔ اس وقت ہندو عملہ باہر برآمدوں میں کھڑا یہ باتیں سُن رہا تھا۔ اتنے میں کسی من چلے نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ داغ دیا جس سے در و دیوار گونج اُٹھے۔ یہ اعلان تھا اس بات کا کہ اب حسابات اور مالیات کی دیوی کے مشرف بہ اسلام

کرنے کا زمانہ آگیا اور واقعی مسلمان ملازمین نے نئے دور میں جس جذبہ سے کام کا آغاز کیا وہ زندہ قوموں کی زندہ روایات کا حامل تھا۔ تقسیم کے بعد ہولناک حادثات سے متأثر ملازموں کی تعداد بھی خاصی تھی لیکن زخم خوردہ دلوں اور مجروح جسموں نے اپنے فرائض میں تن دہی سے کام لیا ——— لیکن بات یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی ہے

رات اور زُلف کا افسانہ

قصہ کوتاہ طُلبی کہانی ہے

ابھی حال ہی میں عجیب صورت حال پیش آئی۔ ہوا یہ کہ کلکتہ دفتر کو اہلِ دفتر سے خالی کرانے کی نوبت آگئی۔ آدم کا خُلد سے نکلنا بھی کسی ایسی ہی رُت اور حالات میں پیش آیا ہوگا۔ شاید رُوح بھی جسم سے ایک روز یونہی دق آکر نکلتی ہے اور عاشق بھی کوئے محبوب سے اسی انداز میں نکالے جاتے ہیں۔ ایک صدی کے مضبوط جذباتی تعلق کے بعد یہ مکان اپنے اصلی مکینوں سے آخرکار خالی کرا ہی لیا گیا۔

لیکن یہ انخلاء بھی خُوب تھا۔ ایم اے جی کا دفتر جو پورے محکمۂ حسابات کے لئے صدرالصدور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عمارت سے نکل کر عجیب انداز میں بکھرا ——— گویا آفتاب عالمتاب کی قبائے دریدہ کے ٹکڑے ٹوٹ کر مختلف مقامات میں گر رہے شعبۂ انتظامیہ کو کشمیر ہوٹل کے برابر والے بنگلے میں منتقل کیا گیا اور

آرٹ کے شعبے گورا قبرستان کے متصل لے جائے گئے ؎

پہلے اس نے مُس کہا پھر تِق کہا پھر بِل کہا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دئیے

اگلے روز میں اس قبرستان کی دیوار پر بیٹھا سیرِ قبور دیکھتا تھا۔ قبرستان کی پہنائی میری نگاہوں میں گردش کر رہی تھی سنگِ مرمر کی سفید فام قبریں مجھے لرزتی نظر آئیں جیسے اُن کے مکیں خاک کی آغوش سے اُبھر کر میری طرف لپک آئیں گے اور میری نیم وا تماشائی آنکھوں پر احتساب کا تازیانہ برسائیں گے ___ اب تو یہ قبرستان اُجڑ چکا۔ سُنا ہے پہلے بڑی رونقوں پر تھا۔ زندہ قوموں کی ہر چیز پر بہار رہتی ہے۔ اُنہیں جینے کا چلن آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ وہ عرصہ گاہِ حیات پر سے برنگِ صبا گزرتے ہیں اور مر جائیں تو اُن کی قبروں پر چمن کھلتے ہیں۔ کچھ یہی حال اس گورستان کا بھی تھا۔ ہر رنگ کے پھول یہاں لائے اور اُگائے جاتے تھے۔ مگر نگر کا گلاب یہاں پایا جاتا۔ ویسے بھی جب کوئی کلی کسی شاخ سے پھوٹتی ہے جوان ہو کر غنچہ بن جاتی ہے۔ اب یہ غنچے کی قسمت ہے جب چاہے کھل کر گلاب بن جائے۔ اُن دنوں یہاں گلاب ہی گلاب تھا۔ بہتیرے گوشے ایسے تھے جہاں کچھ شاخیں فضا میں اُبھرتے اُبھرتے یک لخت اپنی خوشبو کی بہاریں جھوم گئیں اور کسی قریبی پہلو سے بلند ہونے والی شاخوں

سے گلے مل کر گتھ گئیں ۔ باغبانوں نے اس معانقے کو سہارا دے کر محراب بنا دئے رفتہ رفتہ ان محرابوں تلے بیٹھنے کی گنجائش نکل آئی ۔ شاخوں کی گھنی پلکیں مند گئیں اور حسن و شباب ان خلوت کدوں کی گود میں بیٹھے سپنے دیکھنے لگا ۔

وقت کا جلوہ وقت کے ساتھ ساتھ گزر جاتا ہے ۔ گلاب کے پھولوں کی رگوں میں دوڑنے والے عطر کی مہک کو لے کر اُڑنے والی ہوا ایک دن ان شاخوں کے نشیمن ہی بکھیر گئی ۔ پنکھڑیاں پیوندِ زمین ہو گئیں ۔ خلوت کدوں کے سہاگ اُجڑ گئے اور محرومی کی زبان سے نالۂ فراق اُبھر آیا ؎

دردِ جگر نہفتنی قصۂ دل نگفتنی ست
خلوتیاں کجا برم لذتِ ہائے ہائے را

قبرستان کی اداس فضا اور اجاڑ منظر میرے سامنے تھا خیالات کا بیکراں تسلسل اُمڈا چلا آتا ۔ میں سوچ رہا تھا کتنے ہنگامے ہوں گے جو خاک کے دامن میں سمٹ گئے ۔ کتنی شورشیں تھیں جو سکوتِ مستقل میں ڈھل گئیں ۔ کتنے عشوہ طراز گزرے جن کی انگڑائیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئیں ـــــ اب کون بیتی بہاروں کو لے کر آسکتا ہے ماضی کے طاقچوں میں جلتے ہوئے دُھندلے چراغوں کی ضیا دم بدم مدھم ہوتی جاتی ہے ۔ وقت ہر گرفت سے آزاد ہے جس طرح دریا کی طغیانی اور موجِ طوفانی پر بند باندھا جا نہیں سکتا اسی طرح

وقت کو کمندوں میں جکڑنا بشر کی ہمت سے باہر ہے بلکہ خود وقت ہی انسانوں کو موت کے شکنجے میں کس کر ویرانوں میں لا ڈالتا ہے بستیوں کی راہیں ان ویران راستوں سے الگ الگ چلتی ہیں۔ قافلے دائیں بائیں دیکھنے کے عادی نہیں۔ جو شخص ہنگامِ سفر تھک کر گر پڑتا ہے وہ بستی کی راہوں سے کٹ کر ویرانے کی پناہوں میں آجاتا ہے۔

کمانڈ کنٹرولر کا شعبہ ویسٹ رج میں منتقل ہوا۔ کھلی دھوپ، کشادہ ہوا اور انتہائی صحت افزا مقام پر تین چار بارکوں میں اصلی کلکتہ دفتر کو مہمان کیا گیا۔

اس دور افتادہ مقام کی مسافت کو قطع کرنے کے لئے نزدیکی راستوں کی تلاش ہوئی تو "سرائے ہیلی رام" سے گزرے بغیر چارہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بازار کے دریچوں سے جھانکنے والی نگاہیں دور دور تک تعاقب کرتی نظر آئیں —— برسوں سے جن کم نصیبوں نے عورت ذات کی شکل تک نہ دیکھی تھی اب اُنہیں جلوۂ بے محابا کی قاتل نظروں سے گھائل ہونا پڑا۔ صبح حاضری کے بعد بکھری زلفوں کا تذکرہ اور لبِ لعلیں پر تبصرہ رہتا مسکراہٹوں کا ذکر غمزۂ اشارات کی الف لیلیٰ ورق ورق ہو کر میز پر کھل جاتی۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک نئے باب کی کشود ہوتی۔ اعصاب کی شکست اور فکر، نظر کی تشنگی ہر مرحلے پر قدم لیتی ہے، ہائے بشر کتنا مجبور ہے۔

کچھ احباب کے سا نخوردہ چہروں پر کیفِ شبانہ کی ہوائیاں اُڑتی

نظر آنے لگیں اور دھنسی ہوئی آنکھوں کی گہرائیوں میں یہ تحاریر پائی گئی۔ ع

ہزار فصلِ گل آئے جنوں وہ جوش کہاں ۔۔۔ گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

سرائے جیل رام ایک حسین پڑاؤ بن گئی۔ تبدیلیٔ ذائقہ اور سیرِ جلوہ کی لمحاتی فرصت۔ لیکن کسے معلوم ہے اس شاہراہ سے کتنی تہذیبوں کے کارواں اور کتنے تمدنوں کے جلوس گزر رہے ہیں۔ کتنے ہی جو راہ کے نشیب و فراز میں ڈگمگا کر گر پڑے اور قعرِ زمین میں دھنستے چلے گئے۔ قدم قدم گہرے گڑھوں کے وجود سے اس شاہراہ کی قدامت اور حادثات کا سراغ ملتا ہے ۔۔۔ اب ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہو جانے والوں کے قدموں کی گرد اور اُن کے ارمانوں کا غبار اس فضا پر چھایا رہتا ہے۔ کوئی تیز رفتار گاڑی زناٹے بھرتی گزرتی ہے تو ہر سمت آندھیاں چڑھتی نظر آتی ہیں۔ جیسے ناقۂ لیلیٰ کی تیز گامی صحرائے نجد کے کسی ناکام عاشق کے ویران اور شکستہ مزار پر محبت کی چادر چڑھا کر اٹھتی ہے ۔۔ لیکن یاد رہے اب کوئی دوشیزہ تیلی محلے کے کسی کنوئیں پر کلکتہ دفتر کے ملازموں کا منہ نہیں چڑاتی۔ شاید یہ صبحِ نو کا اجالا ہے جو مرہمِ کافور کی مثال پرانے زخموں کا اندمال کر رہا ہے اور اب کسی دروازے سے کوئی تہمتِ بے حاصلی کی صدائے استہزا بن کر نہیں گونجتی ۔۔۔ حال کا لمحۂ گزراں ماضی کی سمت پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔ زندگی اسی رُخ سے اپنے ذہنی خلاء کو پُر کئے دیتی ہے اور انسان اپنی تنہائیوں میں خالی خیالی سہاروں کی انگلیاں پکڑ کر چلتا ہے کہیں راہ گم نہ کر جائے +

گنج ہائے گراں مایہ

راولپنڈی کا ادبی ماحول۔ شعروشاعری کے ہنگاموں سے عبارت ہے۔ وہ ہنگامے جو رفتہ رفتہ اس شہر کی روایات بنتے گئے اور انہی کی لاگ سے اس ماحول کا ادبی خمیر اُٹھتا رہا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب یہ خطۂ ارضِ مغرب کی یلغار اور فرنگی کی گرمئ بازار کا حصّہ بنا اور علاقائی اہمیت کی وجہ سے یہاں فوجی چھاؤنی قائم ہوئی تو راولپنڈی شہر کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ دہلی میرٹھ الہ آباد اور لکھنؤ وغیرہ سے لوگ بسلسلۂ معاش یہاں کھنچ کھنچ کر آنے لگے ـــــ انہی کے ساتھ اُردو زبان بھی اس شہر میں اجنبی مہمان کی طرح در آئی۔ لیکن اس کے ابتدائی تاثرات چھاؤنی ہی تک محدود رہے کیونکہ خواندہ لوگوں کی کھیپ بالخصوص سرکاری

ملازمتوں کے ضمن میں یہاں پہنچی اور شاعری کا ذوق اپنے ساتھ لائی۔
ابتداً یہ چھاؤنی کے مختصر رقبے میں سمٹ کر رہ گئی۔ ان میں کچھ ارباب ذوق
گورا رجمنٹوں میں میر منشی تھے چونکہ اس شاہجہانی پیشے میں فراغت کے
لمحات بآسانی میسر آجاتے اور شاعری بھی کچھ ایسے ہی لمحاتِ فرصت چاہتی
ہے۔ ان کی بدولت چھاؤنی میں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوگیا۔

اوّل اوّل لالکرتی بازار کے قرب و جوار میں کبھی "مسکوٹ" کے
پائیں باغ کے اندر یہ محفلیں منعقد ہوتی رہیں جن میں ہر طبقے کے باذوق
حضرات شریک ہو کر دادِ سخن لیتے دیتے تھے۔ یہ محفلیں اس صدی
کے آغاز تک بدستور قائم تھیں۔ ان میں حصہ لینے والے لاتعداد
شاعروں میں سے دو بقیۃ السیف سخن وروں کو میں نے بھی دیکھا ہے
ایک تو منشی شاہد انبالوی تھے۔ انہوں نے دورِ جدید کے بھی کئی
مشاعرے پڑھے ہیں۔ دوسرے محمد اکبر خاں تھے جو گرامی تخلص کرتے
اور راولپنڈی آرسنل میں دفتری تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں ۱۰۵
برس کی عمر میں انتقال کیا۔ سیاہ رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ میانہ قد و قامت
آخری عمر میں کمر خمیدہ ہوگئی تھی۔ پوری عمر تجرد میں بسر کی۔ افیون
کھاتے اور فکرِ سخن کرتے تھے۔ انہوں نے نعتیں اور اصلاحی نظمیں
بکثرت کہی ہیں۔ اس وقت صرف ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

تجارت جو مسلم کی تگڑی رہے گی
جبھی سر پہ عزت کی پگڑی رہے گی

لکڑ تی بازار کے مشاعروں کو چھوڑ کر شہری آبادی میں اُردو سخن گوئی اور عام پبلک مشاعروں کا آغاز بہت بعد کی بات ہے لیکن بنّی کے ایک بوسیدہ ہوٹل میں پنجابی بیت بازی کی مخصوص نشستیں اکثر جمتی تھیں جن میں گوہرا ور پنجابی کے دوسرے شاعر حصّہ لیتے تھے۔ گوہر حال مست درویش تھے۔ ان سے پہلے اس شہر میں کسی دوسرے معروف اور قابلِ ذکر شاعر کا نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔

غالباً ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے دوران پشاور سے مُرغ بازوں کی ایک ٹولی کے ساتھ احمد علی سائیں وارد ہوئے۔ یہ پنجابی زبان کے نغز گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ایرانی نژاد قزلباش تھے۔ ان کے والد نے ہجرت کر کے پشاور میں سکونت اختیار کر لی، یہیں احمد علی سائیں جو آگے چل کر پنجابی زبان کے غالب بننے والے تھے پیدا ہوئے۔ انہوں نے بچپن ہی میں شعر کہنا آغاز کیا اور پنجابی کے مسلّم الثبوت اُستاد رمزو کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ـــ رمزو پشاور میں گنڈیریاں بیچا کرتے تھے۔ ان کے نغمے میں مٹھاس اور رس دونوں پائے جاتے ہیں انہوں نے حسن و عشق کے معاملات کو خیال آفرینی کے ساتھ نبھایا ہے، ان کے کلام میں فارسیت نمایاں اور قاآنی کے قصائد کی طرح حسین و دل آویز تشبیہات کے ساتھ شوکتِ الفاظ اور روانی پائی جاتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مست الست پیوست رُخ وچ کرن سیت لے زیب عیاریاں دے
دونوں لب عجب شیرین طب لے طبیب عشق دیاں بیماریاں دے
ابرو قوس کمان تے تیر مژگان لے سامان دوہیں اشکاریاں دے
عرق چینی جبین نازنین دے وچ رمزو ڈٹھے آویزے مرواریاں دے

رمزو کے اندازِ فکر اور رنگ شعر کی جھلک سائیں کے کلام میں بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ ویسے اُن کی اپنی شاہراہ سب سے الگ ہے۔ سائیں جیسا کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں۔ اتفاقاً پنڈی آئے تھے۔ اُن دنوں سہگل کی سرائے میں مرغوں کی پالیاں جما کرتی تھیں۔ وہیں ایک زندہ دل رئیس چوہدری گوربخش سنگھ نے سائیں کو دیکھا اور اُن کا گرویدہ ہو گیا رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ سائیں نے پشاور سے ترکِ سکونت کر کے پنڈی کو اپنا مستقر بنا لیا۔

پنڈی میں سائیں کو شاعر کی حیثیت سے چند ہی دنوں میں خاصی شہرت نصیب ہو گئی اور ہر جگہ ان کا طوطی بولنے لگا۔ اُن کے شریکِ بزم ہوتے ہی پنجابی شعر کو بڑا فروغ ہوا اور "باغ سرداراں" میں عام مشاعرے ہونے لگے۔

پنجابی شعر کہنے والے تقریباً تمام شاعروں نے سائیں سے اصلاح لی ہے۔ کرکٹ کا مشہور کھلاڑی محمد ذاکر بھی سائیں کا شاگرد رہا ہے۔ ایک مرتبہ اُستاد اور شاگرد میں شکر رنجی ہو گئی اور مشاعروں میں باہمی چشمک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے۔ باغ کے مشاعرہ میں ذاکر

نے سائیں کو للکار کر یہ شعر پڑھے ؎

مُرغِ دل میرا اداس ہویا ملی خزاں جا اس دی بہار کولوں
نکل جان شاہ رگ دے قریب آگئی نسخہ ملیا نہ ہیتوں دلدار کولوں
رہی جان تن وِچ آوازہ مارے کون رو کے میرے سردار کولوں
ایسے ٹھرک وِچ عمر گزار دتی اسے ذاکر کیمیا نہ ہویا یار کولوں

اب حاضرین میں سے کسی نے سائیں کو پکارا کہ وہ ان اشعار کے جواب میں کچھ کہیں۔ وہ کب چپ رہنے والے تھے۔ خدا کا نام لے کر کھڑے ہو گئے اور فی البدیہہ فرمایا ؎

کیہڑی گل سوزح کے طلب کرنا ایں عیش غم کولوں سکھ آزار کولوں
کھا کے ڈنگ امیدِ شفا رکھنا ایں منگ کے زہر مُہرہ کل مار کولوں
دس خاں اگے وی کسی وصول پایا خون شیر کولوں دل یار کولوں
سیاہ دل کد صاف ہوندے سائیاں جے توں رحم چاہنا ایں ستمگار کولوں

سائیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے بے نیاز اور متاہل زندگی کے بکھیڑوں سے عمر بھر آزاد رہے لیکن شعر اُن کے جذب دروں کا اظہار تھا اور اس اظہار میں اُنہیں خاص مقام حاصل تھا۔ آج بھی پنجابی حلقوں میں جب اُن کا نام آتا ہے۔ لوگ عقیدت سے اُنہیں یاد کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ اُمّی شاعر تھے لیکن شعر گوئی کی بے پناہ فطری صلاحیت اور ایرانی نژاد ہونے کے باعث فارسی میں بھی رواں شعر کہہ لیتے تھے۔ ایک شعر دیکھئے ؎

در کعبہ شغلِ شیشہ و پیمانہ کردہ ایم
ما ہر حرم کردہ ایم دلیرانہ کردہ ایم

اُنہوں نے اُردو میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن تجسس کے باوجود کوئی شعر دستیاب نہیں ہو سکا ہٹی صدر روڈ پہ چوہدری گورکھ سنگھ کے مکان میں جہاں وہ رہتے تھے دن بھر شعر و سخن کی محفل گرم رہا کرتی۔ شام کے وقت عموماً اپنے شاگرد منشی رجب علی جوہر سے ملنے چلے جاتے۔ جوہر بازار چک سازاں کی نکڑ پہ ہوٹل کرتے تھے۔ یہ گویا پنڈی کا "عرب ہوٹل" تھا جہاں ہر قماش اور کینڈے کا شاعر اور سخن فہم آتا جاتا۔

رجب علی جوہر بے پرواہ طبیعت رکھتے تھے۔ جب تک اُن کا بھائی زندہ رہا۔ اس نے ہوٹل کو سنبھالے رکھا اور جوہر بڑے اطمینان سے اپنے ذہنی اشغال میں مصروف رہے۔ بھائی کے انتقال پر بھی اُن کی روش نہیں بدلی جس سے اُن کے متعلقین بہت پریشان ہوئے بلکہ بیگم کے ساتھ شاعری کا مسئلہ ایک مستقل موضوعِ نزاع بن گیا لیکن یہ صورتِ حال تلخی کی ناخوشگوار حد تک نہ پہنچ پائی تھی کہ جوہر کی طبیعت میں از خود انقلاب آگیا اور وہ اپنے کاروبار میں دلچسپی لینے لگے۔ میں نے بھی اُنہیں مدتوں اسی دکان کے تھڑے پہ بیٹھے دیکھا ہے۔ سُرخ و سفید رنگ، براق نورانی داڑھی۔ آنکھوں پہ دبیز شیشوں کا چشمہ لگا ہے۔ دائیں بائیں سالنوں کی دیگچیاں رکھی ہیں۔ قریب ہی کچھ شاگرد اور عقیدتمند کلام کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ان کا ہاتھ کام

ہیں اور وہ باغ کلام میں غلطاں ہوتا۔ شعر ہو جاتا تو بلند اور خوش آیند ترنم میں پڑھتے اور سر بازار واہ واہ کے شور سے یوں محسوس ہوتا جیسے مشاعرہ بپا ہو رہا ہے۔ پنجابی تو خیر اُن کی خانہ زاد کنیز تھی۔ اُردو فارسی پشتو اور کشمیری میں بھی بے تکلف شعر کہہ لیتے تھے۔ اُن کے کلام میں سوز و گداز بہت تھا۔ بے ثباتیٔ دنیا پر ایک قطعہ لکھتے ہیں ؎

شہر خموشاں دے رہن والے کدے وسدے گھراں وچ وسدے سن

طرح طرح دے عیش آرام پلک دے دھوم دھام جہان نوں دسدے سن

آپ سوندے سن تیکئے لگا کے خدمتگار بیٹھے تلیاں جھسدے سن

آج خاک سنگ ہو گئے نیں خاک جوہر جھڑے خاک کو یوں نسدے سن

جوہر نے اسّی سال کی عمر پائی۔ ان کے شاگردوں میں سے غلام نبی کامل۔ ہمسر اور محمد علی نامی تھے۔ نامی نے سو برس سے کچھ زیادہ عمر پا کر حال ہی میں انتقال کیا۔ چند روزہ عارضی میلان اور مشق کے بعد انہوں نے اُردو کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ بڑی کثرت سے غزلیں اور نعتیں کہتے۔ ان کی ایک نعت کسی مغنیہ نے گائی۔ ریکارڈ پر چڑھی اور سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ مطلع ہے ؎

میں سو جاؤں یا مصطفےٰ کہتے کہتے

کھلے آنکھ صلِ علےٰ کہتے کہتے

باغ سرداراں کے پنجابی مشاعرے اس قدر قبولیت حاصل کر گئے کہ آخر کار اُردو کہنے والے حضرات بھی متوجہ ہونے لگے۔ ۱۹۲۳ء میں یہ تحریک ہوئی

کہ ان مشاعروں میں پنجابی کے دوش بدوش اُردو اشعار بھی پڑھے جایا کریں — اس طرح پنڈی میں مخلوط گنگا جمنی مشاعروں کا آغاز ہوا۔ اس شہر کی ادبی تاریخ میں یہ اشتراکِ عمل اتفاقی حادثے سے زیادہ نہیں کہ لسانی اعتبار سے دو مختلف طبقے ادب کے سنگم پر ملے اور کچھ دیر ٹھہرا کر بچھڑ گئے۔ تین چار برس تک یہ مخلوط محفلیں زور شور سے ساتھ جاری رہیں لیکن اس کے بعد شعری سرگرمیاں جدید دور میں داخل ہو گئیں پنجابی شاعری نے اُردو کے قدموں تلے دم توڑ دیا۔ یا کم از کم پنجابی شاعروں میں وہ پہلے کا سا جوش خروش نہ رہا۔ سائیں پشاور چلے گئے جہاں ۱۹۳۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی مفارقت سے پنجابی شعر و سخن کی محفل اُجڑ گئی اور مجرد اُردو مشاعروں کے لئے میدان صاف ہونے لگا۔

اس دلچسپ اور یادگار دَور میں پنجابی کے جن مشاہیر نے حصّہ لیا اُن کا کم و بیش ذکر پہلے کیا جا چکا۔ اس گروہ میں جس کے سرخیل سائیں مرحوم تھے۔ اللہ داد جنگی۔ نذر شاہ مضطر اور گل محمد گُل کا نام بھی لیا جاتا ہے اُردو کے شاعروں میں عطا محمد طاہر۔ حاجی سرحدی۔ محمد علی نامی اور خدا بخش اظہر تھے۔ طاہر ان سب میں ممتاز تھے۔ انہی کی بزمِ سخن مخلوط مشاعروں کا اہتمام کرتی تھی۔ وہ شعر کا اُونچا مذاق رکھتے تھے کلام نکھرا ہوا تھا۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے :-

مہ تاباں یہ مری آنکھ لگی رہتی ہے
منزلوں اُن کے تصوّر میں چلا جاتا ہوں

میں بھی کہسار کی ندی کی طرح ہوں طاہر
نغمہ سنسان چٹانوں کو سنا جاتا ہوں

راولپنڈی میں صحیح ادبی فضا قائم کرنے۔ اسے نکھارنے اور سنوارنے میں اُن کے ذوق و تجسس کا بہت کچھ دخل رہا ہے۔ وہ عرصے تک پنڈی میں رہے پھر لاہور چلے گئے جہاں ہومیو پیتھک مطب کھول لیا۔ فروری ۱۹۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کے شاگردوں میں سے عبدالعزیز فطرت پروفیسر اعظم۔ حافظ عبدالرشید۔ خدا بخش اظہر۔ خدا بخش خلش اور کھیم راج خاک قابلِ ذکر ہیں۔

انہی دنوں پنڈی کے ادبی افق پر ایک اور ستارہ نمودار ہوا جس کی چمک منفرد تھی۔ یہ آغا محمد صدیق حسن ضیا تھے۔ شمعِ سخن فروزاں تھی کہ پروانہ وار آئے اور محفل پر چھا گئے۔ اُنہیں بچپن ہی سے ڈرامہ لکھنے کا شوق تھا۔ اسی شوق میں شعر و شاعری کے مراحل طے ہو گئے۔ ان دنوں مشاعروں کی طرحی اور غیر طرحی غزلوں میں آغا ضیا کے اچھے اچھے شعر ہوتے جن سے اہلِ محفل چونک گئے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

کسی کی زلف میں ہوتی تو حُسن کہلاتی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

جناب طاہر نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ آغا ضیاء کو ہیرو بنا کر مشاعروں میں پیش کیا اور اپنے کلام میں بھی اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اُن کے ایک شعر کا مصرعۂ ثانی ہے ؎

محفل میں زور تو ابھی آغا ضیا کا ہے

یہ زور شور آغا ضیا کے بے مثال کلام کا تھا۔ یہ محض زور ہی نہ تھا بلکہ اس زور سے پنڈی کی ادبی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا جس نے مقامی شاعروں کے فکر کو بھی بیدار کیا۔ چنانچہ ہم اس وقفہ کو جو ۲۶ء سے ۴۵ء تک محیط ہے۔ بجا طور پر آغا ضیا کے دور سے موسوم کر سکتے ہیں کیونکہ اس تمام تر مدت میں کوئی اہم ادبی معرکہ ایسا نہیں جو اُن کے نام پر ختم نہ ہوا ہو۔

اس دوران کہ باغ سرداراں میں فکر و سخن کے ہنگامے گرم نوا تھے۔ شہر میں طباعتی اور اشاعتی سرگرمیاں بھی تیز ہونے لگیں۔ "ترجمانِ سرحد" اور "شہاب" دو ہفت روزے جاری ہوئے۔ ۲۵ء میں حکیم عبدالخالق کی سرپرستی اور طاہر مرحوم اور شوق سوجانپوری کی ادارت میں ماہنامہ "نسیمِ سحر" بھی نکلا۔

اس سے بہت پہلے کی بات ہے۔ قاضی سراج الدین احمد بیرسٹر نے "صراطِ مستقیم" کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ نکالا تھا۔ اس میں مذہبی اور سیاسی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ قاضی مرحوم نے پنڈی میں سب سے پہلے ایک دستی چھاپہ خانہ "چودہویں صدی ہنیڈ پریس" کے نام سے قلعہ بازار کلاں میں قائم کیا تھا۔ قاضی صاحب اپنے عہد کے مشہور قلمکار تھے۔ ان کا وطنِ مالوف بھیرہ تھا۔ انہوں نے سرسید احمد مرحوم کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی۔

چند سے بعد کسی ریاست سے ایک انگریزی ہفت روزہ جاری کیا۔ پھر انگلینڈ گئے اور بیرسٹری پاس کر کے پنڈی آ گئے۔ ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں بسر کی "داستانِ پاکستان" کے نام سے "تاریخی ناول کا سلسلہ شروع کیا جس کے دو حصے ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ انہوں نے مولانا شبلی مرحوم کی "الفاروق" طبع ہونے سے پہلے اسی نام سے ایک کتاب بھی شائع کر دی تھی جسے سر سید مرحوم نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا اور کسی مضمون میں اس کے متعلق تلخ جملے بھی لکھے ——— قاضی سراج الدین مرحوم کے علاوہ اس دور میں کوئی قابلِ ذکر ادیب نہیں گزرا۔ یوں بھی اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ یہاں نثر کی کھیتی ہمیشہ سے خشک رہی ہے۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ جب بھی کوئی نہال اس مٹی سے سر اٹھاتا ہے، شعر کے نغموں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

"باغ سرداراں" کی مخلوط محفلیں ابھی درہم نہ ہوئی تھیں کہ بہت سے اہلِ قلم میدان میں اُتر آئے۔ اور شعر کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ اب تک طاہر مشاعروں کا انتظام خود کرتے تھے ۲۸ء کے لگ بھگ انہوں نے یہ خدمت اپنے شاگرد فطرت کو سونپ دی۔

فطرت نے عنانِ بزم سنبھالتے ہی باغ سرداراں کی جگہ اسلامیہ ہائی اسکول کو ادبی مرکز بنا لیا۔

اسلامیہ اسکول سے ہماری مقامی ادبی اور شعری روایات کو دیرینہ

علاقہ رہا ہے۔ اس کی چار دیواری بڑے بڑے رفیع الشان اجتماعات کی آئینہ دار ہے۔ اس کی عمارت کے ہر تنگ اور کشادہ روزن پہ جہاں اک طرف چندے کا کشکول لٹکتا رہا ہے وہاں دوسری جانب زورِ خطابت اور شعر وسخن کے چشمے بھی اُبلتے رہے ہیں۔

۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے اسی اسکول کے میدان میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں دیگر مشاہیر کے علاوہ مولانا شوکت علی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک تھے۔ لیکن ان کی شرکت عجیب ڈرامائی انداز سے ہوئی۔ پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے انگریزوں کی ناؤ بھنور میں پھنس گئی۔ اُن دنوں پنجاب گیر پیمانے پر یہ تحریک چل رہی تھی کہ" فوج اور پولیس کی نوکری قطعی حرام ہے"۔ اور عوام الناس اس نعرے سے متاثر بھی ہو گئے تھے۔ خطہ پوٹھوہار بازوئے شمشیر زن کی حیثیت رکھتا تھا۔ پشتینی وفادار، حکومت نواز مفاد پرست اور نمک خوار اسی علاقے میں بستے رہتے اور موت سے بھڑ جانے والے سپاہی اتنے ارزاں دستیاب ہوتے کہ اس قیمت پر قصاب کو بکرے بھی نہیں ملتے تھے۔ اسی جنگ کے دوران جس جہنمی نے کعبۃ اللہ پہ پہلی گولی چلائی وہ اسی خطہ کا رہنے والا تھا۔ رسوائے زمانہ کرنل لارنس آف عریبیا کے لئے معتمد محافظوں کی حیثیت سے اسی علاقے کے نوجوانوں کو لیا گیا تھا۔ انہوں نے پہلے فرانس اور پھر مصر کے "سیوائے ہوٹل"

میں ضروری ٹریننگ حاصل کی اور جنگ کے خاتمہ تک کرنل لارنس کے ساتھ رہے اور کارِ خاص میں اس کی معاونت کر کے اس علاقہ کا نام روشن کیا۔

بھرتی کے کام میں رکاوٹ سے انگریز کو بجا طور پر تشویش لاحق تھی لیکن بعض درد مند مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں نے چالاکی سے کام لے کر مسلمانوں پر معیشت کے دروازے بند کرنے اور فنِ حرب و ضرب سیکھنے سے محروم رکھنے کے لئے "فوج کی نوکری حرام ہے" کا نعرہ لگوایا ہے۔ چنانچہ اس طلسم کو توڑنے کے لئے وسیع پیمانے پر ایک مہم چلائی گئی۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈھونگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا ان دنوں اس نوعیت کی کانفرنسیں علی گڑھ کی مجلسِ انتظامیہ کے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ ۱۶ء کی سالانہ کانفرنس یو پی کے کسی شہر میں ہونیوالی تھی کہ قاضی سراج الدین مرحوم خود علی گڑھ گئے اور کارپردازانِ مجلس کو قائل کر دیا کہ امسال اگر راولپنڈی میں کانفرنس ہو تو اس پس ماندہ علاقے میں علی گڑھ تحریک کی تبلیغ کے ساتھ خاطر خواہ چندہ جمع ہونے کے خاصے امکانات ہیں۔

وقت اگرچہ کم تھا تاہم حکومت کے مکمل تعاون سے اسلامیہ ہائی اسکول میں کانفرنس کی تیاریاں زور شور کے ساتھ شروع ہو گئیں۔ باہر سے علمائے کرام، شیریں مقال واعظ اور خوش الحان نعت خواں

در آمد کیے گئے۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس شروع ہوا ہی تھا کہ سکول کے سامنے ایک تانگہ آکر رکا اور تین اصحاب اتر کر پنڈال کی طرف بڑھے۔ سٹیج کی نشستوں کے تین ٹکٹ انہوں نے خرید کیے اور اطمینان کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے سٹیج پہ جا کر بیٹھ گئے۔ ان تینوں کے چہرے مہرے اور لباس نے سارے پنڈال کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔۔۔ یہ علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ ان کے ناموں سے پڑھا لکھا طبقہ بخوبی آشنا تھا لیکن پنڈی کے بہت کم لوگوں نے انہیں اس سے پہلے دیکھا۔ جن لوگوں نے انہیں پہچان لیا انہوں نے ساتھ والوں سے کہا اور ساتھ والوں نے آگے نشر کر دیا حتیٰ کہ پنڈال سارے کا سارا گدگدا گیا۔ پنڈی والے "زندہ باد" کا نعرہ بہت جلد لگاتے ہیں اور دل گرما دینے والی تقریریں سننے کا بھی بے تحاشا ذوق رکھتے ہیں۔۔۔ اجلاس کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ منتظمین جلسہ کے حواس باختہ ہو گئے۔ حاضرین کا تقاضہ تھا کہ ابوالکلام آزاد شریکِ محفل ہیں لہذا اپنی تقریر سے نوازیں۔ قاضی سراج الدین سٹیج سیکرٹری تھے انہوں نے اعلان کیا کہ جلسہ اپنے پروگرام کے مطابق جاری رہے گا اور آخر میں وقت ہوا تو مولانا ابوالکلام بھی خطاب فرمائیں گے لیکن کون مان کر دیتا۔ آخر کار ابوالکلام آزاد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور برابر تین گھنٹے تک "توحید" کے موضوع پر تقریر

کی ـــ پنڈی میں ابوالکلام آزاد کی یہ پہلی تقریر تھی۔ خطابت کے البیلے انداز اور شعلہ نوائی نے ہواؤں کا ایسا رُخ پلٹا کہ فوجی بھرتی کی سکیم کا بھُرتہ ہو گیا۔

اگلے روز کے اجلاس میں یہ تینوں لیڈر پھر پہنچ گئے۔ ابھی جلسہ شروع نہ ہوا تھا کہ انگریز کمشنر مسٹر پایم بیگ اور اس کی دختر نیک اختر بھی تشریف لائے۔ سٹیج پر علمائے کرام سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ نازک اندام دخترِ افرنگ کے سفید فام ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو اس نے ابوالکلام آزاد کو پیش کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ابوالکلام کہا کرتے تھے۔ ع

دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

آزاد نے گلدستے کو ہونٹوں کے قریب لا کر غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

اے بادِ صبح عطرے ازاں پیرہن بیار
تسکیں ز بوئے گُل نہ پذیرد مشامِ ما

پھولوں کی مہک پارہ پارہ ہو کر ہر طرف پھیل گئی اور پورا سٹیج تبسم زار بن گیا۔ مگر دوشیزۂ مغرب کچھ سمجھ نہ پائی۔ مولانا محمد علی نے شعر کا انگریزی ترجمہ سنایا جسے سُن کر دُور دیس کی الہڑ جوانی جھوم گئی اور التجا کی کہ دونوں لیڈروں کے آٹو گراف۔ فارسی شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ لکھ کر اُسے دیا جائے۔ چنانچہ اس کی یہ آرزو پوری کر دی گئی۔

اسی اسلامیہ سکول میں فطرت نے بزمِ ادب کے سیکرٹری کی حیثیت سے

بڑے بڑے مشاعرے کرائے جس میں کبھی کبھار باہر سے بھی شعرا کو مدعو کر لیا جاتا اور کبھی کبھی کسی نامی گرامی شخصیت کو صدارت کی زحمت دی جاتی۔ ۱۹۲۹ء میں عدم بہ صیغۂ ملازمت راولپنڈی آئے اور ادبی ہنگاموں میں پُرجوش حصہ لینے لگے۔

———

اس طرح مقامی شعراء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور یکے بعد دیگرے ناظر اوجلوی ولایت حسین ثاقب، مقبول حسین شاہ، محمد اسمٰعیل سروش، شفیق کھاتولوی، رسا بریلوی، جلیس لکھنوی، باقی صدیقی، فضل الرحمٰن آشک، عطاء اللہ کلیم، محمد ابن ساحر، اصغر علی احسن، تلوک چند محروم، رام ناتھ یاس، برج لال رعنا اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ شریک محفل ہوتے چلے گئے۔

عدم اُن دنوں بھی انا ولا غیری کے زعم میں مبتلا تھے۔ فرماتے ہیں ؎

جوش یو پی میں غزل خواں ہے عدم پنجاب میں

ان میں اس وقت بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے نمایاں آثار تھے۔ بالخصوص نظم کہنے کا ایک جداگانہ انداز رکھتے۔ جہاں تک عدم کی خالص ذہنی صلاحیتوں کا تعلق ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پنڈی کے نوخیز شعرا کا ایک حلقہ اُن کے رنگ سے خاصہ اثر لیتا رہا۔

عدم نے پنڈی میں ادبی جھتے بندی کے فن کو بھی بڑے عروج پر پہنچایا اور اس کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ بعض بڑی بڑی اچھی غزلیں

اور نظمیں اُسی دَور میں ہوئیں۔ اس جتھے بندی نے پہلے تو ادبی سیاست کو جنم دیا پھر علامؔ کی الگ ایک "بزم اُردو" معرضِ وجود میں آئی جس کے اہتمام سے دو چار اچھے مشاعرے شہر میں ہوئے لیکن جو لوگ گروہ بندی سے دامن بچائے رہے وہ آغا ضیاؔ کے علاوہ تلوک چند محرومؔ۔ فضل الرحمٰن اشکؔ اور باقی صدیقی تھے۔

باقی صدیقی نے آغاز میں پنجابی شعر کہنا اختیار کیا تھا لیکن بہت جلد اُردو کو اپنا لیا۔ مقامی مشاعروں میں حصّہ لیا پھر بمبئی چلے گئے اور فلموں کے لئے گیت اور مکالمے لکھتے رہے۔ اُنہوں نے اپنا راستہ بڑی مشکل سے نکالا چونکہ کسی بھی جتھے سے اُن کا تعلق نہ تھا اس لئے شہرت کا زینہ جلد طے نہ کر سکے تاہم ۱۹۳۵ء سے وہ غزل کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو رہے۔ اور اب اپنی منزل کو پہنچ گئے ہیں۔

انجم رضوانی نے علم و ادب اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں پایا ہے۔ طبعِ رسا رکھتے ہیں اور شعر و سخن کے خاموش اور متین خادم ہیں۔

تلوک چند محرومؔ کے نام اور کلام سے ایک زمانہ آشنا ہے وُہ تقسیم سے پہلے مدتوں پنڈی میں رہے۔ وہ بلاشبہ مُلک کے مشاہیر میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے لیکن اپنی حیثیت اور مقام کے احساس یا طبیعت کی فطری افتاد کی بنا پر عزلت اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بہرحال پنڈی کو یہ تاریخی فخر ہمیشہ حاصل

رہے گا کہ محروم جیسا عظیم شاعر یہاں رہا ہے۔

محروم کے فرزند جگن ناتھ آزاد بھی مقامی ادبیات میں دلچسپی لیتے رہے لیکن ان کی اصل پرواز کا زمانہ تقسیم ہندوستان سے کچھ مدت پہلے قیام لاہور کے دوران شروع ہوا اور پھر تقسیم کے بعد تو وہ خوب چمکے ہیں۔ اسی طرح رام لعل بھی جب لکھنؤ پہنچ گئے تو معلوم ہوا پنڈی کے رہنے والے تھے۔

حاجی سرحدی نے ۶۹ء میں ۹۵ برس کی عمر میں انتقال کیا آغاز شباب میں انگریزوں کو پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا اور قیام پاکستان تک یہی دھندا کرتے رہے۔ چیمبرز ڈکشنری کا پشتو ترجمہ کیا اور طبع کرایا۔ یہ ترجمہ آج بھی دستیاب ہے۔ سرحدی ہونے کے باوجود شستہ اور رواں اردو بول لیتے تھے۔ مزاج شگفتہ اور طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ بات میں بات پیدا کرتے اور طویل قہقہے لگاتے۔ انہیں مادہ تاریخ نکالنے میں کمال حاصل تھا۔ "زمانہ" کانپور نے انہیں "وحید المومنین" کا خطاب دیا تھا۔

بزم ادب کی سرگرمیاں نصف النہار پر تھیں کہ راولپنڈی سے "رخشان" کے نام سے ایک ماہوار مجلہ جاری ہوا۔ شریف احمد عیاں اس کے مدیر تھے۔ ادبی حلقوں میں یہ ماہنامہ بہت مقبول ہوا۔ ایک اور شگوفہ سالک کے نام سے پھوٹا لیکن پھول بننے سے پیشتر ہی مرجھا گیا۔

سنہ ۴۸ء میں ایک اور انجمن "معیارِ ادب" قائم ہوئی۔ اس کے کارپرداز تمام تر ہندو نوجوان اہلِ سخن تھے جن میں برہم دت عما، ہرکشن شاد اور ہربنس لال نسیم قابلِ ذکر ہیں۔ اس بزم کے اہتمام سے بھی بڑے اچھے اجتماع ہوئے۔

انجمن ترقی اُردو کی مقامی شاخ کے سیکرٹری حفیظ الوری تھے۔ اُنہوں نے بھی چند ایک یادگار مشاعرے کرائے۔

قیامِ پاکستان سے چند برس اور جن نوجوانوں نے قدم بڑھایا اُن میں افضل پرویز۔ جمیل ملک۔ صادق نسیم، احمد ظفر، محبوب محسن، حفیظ الوری محبوب الرحمٰن اختر اور قیس شفائی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یوسف ظفر نے بھی شعور کی آنکھیں پنڈی میں کھولیں چونکہ وہ میرے بچپن کا یار بیلی ہے۔ مجھے اس کے سفر کا آغاز یاد ہے۔ ستائیس رمضان کی رات ختم قرآن کے موقعہ پر مساجد میں درود و سلام کی محفلوں میں تحت اللفظ نعت خوانی سے اس نے اپنی گویائی کی ابتدا کی۔ پھر حالات کی گردش میں رختِ سفر باندھا۔ کم و بیش ربع صدی کے بعد وہ چھوڑی ہوئی منزل پر واپس آیا تو عقیدے کی گہرائیوں میں اُترا ہوا مکمل الحاج بن چکا تھا۔

تقسیم سے پہلے ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہاں آباد تھے اور ان میں ثقافتی یا تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے کوئی ایک قدر بھی مشترک نہ تھی۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اُردو کسی گروہ کی قومی

زبان نہ تھی۔ بلکہ جو چاہتا اسے اپنے ارادے سے سیکھ کر اپنا لیتا۔ عام اس سے کہ وہ گھر میں پنجابی پوٹھوہاری یا پوربی زبان بولتا ہو۔ علاوہ ازیں ادبی اعتبار سے بھی اُردو اس قریہ کے رگ و پے میں رَچ نہ سکی۔ شہر اور صدر کے مختلف حصے جغرافیائی حدود کے پابند تھے مثلاً صدر کے بعض محلوں یعنی دھوبی احاطہ اور گلی بزازاں وغیرہ میں بلاشبہ گھسی پٹی اُردو ہی بولی جاتی تھی لیکن قلب شہر میں پنجابی ہی سے کاروبار چلتے تھے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اُردو بعض خاندانوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی یا مکتب میں سبقاً پڑھائی جاتی تھی۔ یا چند اہل قلم کی سخن گوئی کا ذریعۂ اظہار تھی۔

یہاں ایک عظیم تاریخی نوعیت کی علمی اور ادبی کاوش کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اُسی دَور کے اندر پنڈی ہی میں قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ مکمل ہوا۔ یہ کارنامہ میرے دادا مرحوم مولانا ہدایت اللہ صاحب نے انجام دیا۔ درس و تدریس اور ایک چھوٹے سے مطب کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ ۲۵ برس کی محنت شاقہ کے بعد برِ صغیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پنجابی زبان میں کلام پاک کا یہ ترجمہ معرض وجود میں آیا۔ اُنہوں نے اُنیس پانچ پاروں کی ایک جلد خود اپنی لاگت سے طبع کرائی۔ لیکن بقیہ کی نوبت نہ آسکی اور دادا جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کے انتقال کے بعد میرے اباجی مرحوم نے ہر ممکن سعی کی کہ کسی عنوان مکمل ترجمے کی اشاعت کا سروسامان ہوجائے۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کوئی ناشر اتنے بڑے کام کو ہاتھ میں لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہ محض میرے خانوادہ کی بدنصیبی نہ تھی۔ ملی نقصان بھی تھا جس کا ہمارے سوا کسی کو احساس نہ تھا۔ آخرکار اگست ۵۷ء کو اباجی کا بھی انتقال ہوگیا۔

اپنے اب وجد کا قلمی خزانہ اور قیمتی کتب خانہ میرے ورثہ میں آیا تو چند نادر طبی قلمی کتب کے علاوہ اس ترجمے کی اشاعت نے مجھے سخت پریشان رکھا۔ میں نے مقامی اخبارات میں مضامین بھی لکھے تاکہ کوئی دردمند مسلمان پبلشر اس قومی امانت کو دستبرد زمانہ سے بچانے کا اہتمام کرے لیکن کسی نے توجہ نہ کی۔ میری بے تابی بڑھتی گئی اور اس اضطراب پر دس برس کی جانکاہ مدت گذر گئی۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر میں نے محسوس کیا۔ اب شاید اس راستے پر مجھے خود ہی ہمت کر کے نکلنا ہوگا۔ میں نے اپنے رہائشی مکان کو رہن کر کے ترجمے کی اشاعت کا مصمم ارادہ کرلیا اور اس سلسلے میں طباعت کے اخراجات کا اندازہ کرنے کے لاہور کے چیدہ چھاپہ خانوں سے خط وکتابت شروع کردی۔ لیکن عین انہی دنوں رحمت خداوندی جوش میں آئی اور میری بے کسی کو سہارا مل گیا۔ یہ ۶۷ء کے آخر کا ذکر ہے۔ میں نے اڑتی ہوئی سی خبر سنی کہ پنجابی ادبی لیگ لاہور قرآن مجید

کے پنجابی ترجمے کے لئے کوشاں ہے۔ میں ۵ر جنوری ۱۹۶۸ء کو مسودہ اور مطبوعہ پانچ پاروں کا نسخہ لے کر لاہور گیا اور دین محمدی پریس کے مالک جناب محمد عارف سے ملا۔ انہوں نے اپنے جواں سال بھائی ملک عبدالرحمٰن کو ہمراہ لیا اور مجھے پنجابی لیگ کے صدر جناب نیاز محمد خاں صاحب کے پاس لے گئے۔ بڑے ہی دوستانہ ماحول میں کوئی دو گھنٹے تک مفصل گفتگو رہی۔ اور صاحب موصوف نے لیگ کے اہتمام سے اس کی طبع اوّل کا ذمہ لے لیا۔

اس وقت کہ میری کتاب "راول دیس" پریس میں بھیجی جا رہی ہے اللہ کریم کی بے پایاں عنایت سے پنجابی ترجمہ مع متن شائع ہو کر مارکیٹ میں پہنچ چکا ہے۔ اس طرح یہ بوجھ میرے کندھوں سے اُترا۔ خدا کرے اب دادا مرحوم کی لکھی ہوئی سورۃ بقر کی مکمل پنجابی تفسیر بھی جلد طبع ہو جائے۔

سیاسی اُفق

اس خاک کا ماضی بڑی حد تک تابناک رہا۔ سن ستاون میں حقیر پیمانے پر یہاں بھی ہنگامہ ہوا جس کے نتیجے میں دو ڈاکٹر پھانسی پا گئے۔ پھر اک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ یہ شہر تحریک مجاہدین کا موثر اور کارفرما اڈا بن گیا۔ مولوی جعفر تھانیسری والے مشہور مقدمۂ بغاوت کے ملزم محمد شفیع کو پنڈی سے گرفتار کر کے انبالہ لے گئے تھے۔ وہ فوج میں گوشت کی سپلائی کا ٹھیکیدار تھا۔ اس کے اور بھی ساتھی ہونگے جو غالباً پکڑے نہیں گئے۔ اس مقدمہ نے فی الجملہ خوف و ہراس پھیلا دیا۔ پھر بھی سرحد کے پار مجاہدین کی مالی امداد کا صیغہ بند نہ ہو سکا۔ شیخ نبی بخش سنز کے پاس بیسویں صدی کے اوائل عشرہ تک روپیہ جمع ہوتا اور سرحد پار پہنچتا رہا۔

۱۹۲۰ء کے لگ بھگ مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی نے پنڈی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہ آہن گر تھے لیکن علوم دینی کے ساتھ انگریزی پر بھی خاصہ عبور تھا۔ بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آغازِ جوانی میں تحریکِ مجاہدین سے متاثر ہوتے اور عملی میدان میں کود گئے۔ اُنہوں نے جانبازوں کا حلقہ منظم کر کے وسیع پیمانے پر تشدد آمیز کاروائیاں کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ابتدا پنڈی کلب مال روڈ سے ہوئی۔ عمارت کو اُڑانے کے لیئے ٹائم بم رکھ چکے تھے کہ حکومت کو علم ہو گیا۔ مولوی صاحب کے وارنٹ جاری ہو گئے لیکن اُنہوں نے چار ابرو کا صفایا کرایا اور راتوں رات سرحد عبور کر کے علاقہ غیر میں پہنچ گئے۔ ان کا ایک معتمد دوست ابراہیم وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ لاہور میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ اس مقدمہ کا سارا ریکارڈ اور مولوی فضل الٰہی کے بہت سے خطوط میرے گھر میں محفوظ تھے لیکن میرے اباجی نے کسی مصلحت کی وجہ سے اس قیمتی ذخیرہ کو نذرِ آتش کر دیا۔

قریب قریب اسی انقلابی ذہن کے ایک اور بزرگ رئیس الاحرار مولانا محمد اسحٰق مانسہروی مرحوم تھے۔ ان کا کچھ حال میں نے اپنی کتاب کے کسی دوسرے باب میں تحریر کیا ہے۔ افسوس ہے مولانا مرحوم کسی تنظیم کی بنیاد نہ رکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کر گزرتے تو شاید تاریخ میں بڑا نام پیدا کرتے کیونکہ ان کی جاذب اور نڈر شخصیت سے حکومت ہمیشہ خوفزدہ رہی لیکن وہ خود ہی کسی بنا پر انقلابی روش سے دل برداشتہ

ہو گئے۔ "احیاء العلوم" کے نام سے محلہ امام باڑہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کر دی۔ آخری مرتبہ اُنہیں مسجد شہید گنج تحریک میں دیکھا گیا جب انہوں نے پنڈی میں موتمر کا نفرنس بلائی۔ یہ کانفرنس جون ۳۵ء کو مسجد انگور محلہ امام باڑہ میں منعقد ہوئی۔ اس میں حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحبؒ اور علامہ مشرقی مرحوم بھی شریک ہوئے پیر صاحب کو اتفاق رائے سے امیرِ ملّت منتخب کیا گیا اور ان کی قیادت میں بڑی اُمیدوں اور ولولوں کے ساتھ ملت کا قافلہ روانہ ہوا۔ مگر بہت جلد صحرائے ناکامی میں اس کاروانِ ذوق و شوق کے پُرزے اُڑ گئے۔

مجلس احرارِ اسلام بھی اسی تحریک میں نسبتاً منشا ہوئی۔ ورنہ اس سے چار برس اُدھر کی بات ہے کہ ۳۱ء کی تحریک کشمیر میں احرارِ اسلام کے اٹھائیس ہزار رضا کار جیلوں میں ٹھونسے گئے تھے۔ اُن دنوں تحریکِ کشمیر کا مقامی دفتر موچی بازار میں حکیم عبدالغنی کا مطب تھا۔ جہاں رضا کاروں کے کھانے دانے کا انتظام ہوتا۔ باہر کے جیش وہیں آ کر ٹھہرتے اور احکام حاصل کر کے ریاست کشمیر میں داخلے کی خاطر روانہ ہوتے اور کوہالہ پل پر گرفتار ہو جاتے۔ شہر میں مرکزی جامع مسجد سے ہر روز ایک جلوس برآمد ہوتا اور راجہ بازار میں گرفتاریاں عمل میں آتیں۔ سید غلام مصطفےٰ شاہ خالد گیلانی بھی انہی دنوں میدانِ عمل میں نکلے اور زندگی میں پہلی بار فرنگ کی اسیری سے

آشنا ہوئے۔

اس سے پہلے ہندو نیشنل کانگریس اور خلافت کی تحریکیں بھی اپنے اپنے وقت پر توجہ کا مرکز رہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا شور بھی زور پر رہا۔ لیکن ان تحریکوں میں شدت کی ہوا لاوقتی جذبات کے الاؤ سے اُبل کر جس طرف چاہتی نکل جاتی۔ دل کے دروازوں پر عقل کے پاسبان ہر وقت پہرہ نہیں دیتے۔ چنانچہ وقتی اور آنی جوش ختم ہونے پر محسوس ہوتا کہ دماغ کی جگہ دل سے تدبر کا کام لیا گیا تھا اور یہ تجربہ ناکام رہا۔ ہندو مسلم اتحاد کی آواز بھی دھندلکوں سے اُبھری اور اندھیروں میں تحلیل ہو گئی۔ دو ایسی قومیں کہ ذہنی اشتراک ان میں فطری لحاظ سے مفقود تھا۔ ملک کی آزادی کے نام پر اشتراکِ عمل کے لئے آمادۂ کار ہوئیں لیکن توحید کے پرستاروں کو مشرکانہ اوہام میں جذب کرنے کے لئے یہ چور دروازہ کھولا گیا تھا۔ روغن اگر پانی میں مل سکتا تو ضرور مل جاتا۔ لیکن مختلف نوع کے عناصر آپس میں لاگ کھا سکتے ہیں نہ اُن کا امتزاج ممکن ہوا۔ جس شدت کے ساتھ دو دریا ایک سنگم پہ ملے اُتنی ہی سُرعت سے ان کا اتصال پراگندہ ہو گیا۔

جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔ منڈی کا سیاسی مزاج ہر دور میں خالص اسلامی رہا۔ اس کے علاوہ منڈی کے مسلمان کسی اور زبان کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ اور عناصر بھی

مصروفِ کار رہے لیکن ان کی یہ تگ و دو بیکار رہی گئی۔ تقسیم سے پہلے سوشلسٹ نظریہ پر ایمان رکھنے والے پانچ چھ نوجوان ٹیلر ماسٹر تھے۔ لیکن کسی نے اشتراکی سوزن سے پیراہن چاک کو رفو کرانے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی۔

نومبر ۱۹۳۶ء کے وسط میں قائدِ اعظمؒ نے مقامی انجمن اسلامیہ کے صدر خان بہادر شیخ محمد اسمٰعیل کو خط لکھا کہ میں پنجاب میں مسلمانوں کی تنظیم کے سلسلہ میں دورہ کرنے والا ہوں۔ ارادہ ہے کہ پنڈی کے مسلمانوں سے بھی خطاب کروں۔

صدر نے یہ خط انجمن کے سکرٹری میاں حیات بخش انجنیئر کے حوالے کیا تاکہ وہ اجتماع کا سروسامان کریں۔ میاں صاحب نے ایک چند عمائدینِ شہر کو دعوت نامے بھیجے اور دسمبر ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتے میں جلسہ کی تاریخ متعین کرنے کے بعد قائدِ اعظمؒ کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ قائدِ اعظمؒ تشریف لائے۔ اسلامیہ ہائی اسکول کے اس گوشے میں جہاں اب طلباء کے مسجد بن گئی ہے۔ چھوٹا سا پنڈال لگایا گیا۔ اعلان کے مطابق جلسہ کا وقت ہوگیا۔ حضرت قائد جلسہ گاہ پہنچ لئے لیکن حاضرین کی تعداد ستائیس سے زیادہ نہ تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے مختصر حاضری ہی کو غنیمت جان کر حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد سامعین میں سے کسی نے کہا ــ "پنجاب میں اس وقت سر

فضل حسین مسلمانوں کے لیڈر رہیں اور انہیں حکومت میں بھی اثر و رسوخ حاصل ہے۔ اس لئے کسی متبادل قیادت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"
قائدِ اعظمؒ نے جواب دیا کہ مجھے بھی سر فضل کی خدمات کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں ان کی حیثیت ٹوٹے ہوئے چھکڑے کے اناڑی کوچوان سے زیادہ نہیں۔ ان کی ذات سے مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا حل محض خوش فہمی اور حسنِ ظن ہے۔"

جلسہ برخاست ہوا کچھ لوگ حضرت قائدؒ کے پیام کو سمجھے اور کچھ اُن کے دامانِ گفتار تک پہنچ ہی نہ سکے۔ تاہم پنڈی میں حضرت قائد کی یہ پہلی آمد بھی اُن کی محبوب شخصیت کے وہ خد و خال جو آگے چل کر نمایاں ہوئے ابھی سراپردۂ امکان میں نہاں تھے لیکن اس شہر میں اُن کی خوش لباسی اور خوش گفتاری کا اوّلین تعارف تاریخی اعتبار سے ایک اہمیت ضرور رکھتا ہے۔

قائدِ اعظمؒ دوسری مرتبہ ۳۹ء میں تشریف لائے۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے آثار اُفق پر نمودار ہو چکے تھے اور حضرت قائد کی ذات برصغیر کے مسلمانوں کا واحد آسرا بنتی جا رہی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ اپنے لۂ اور راعلیہ کے ساتھ زور پکڑتا جا رہا تھا اور ہندو بھی اسی شدت کے ساتھ مخالفت میں لگے ہوئے تھے اس مرتبہ بھی اسلامیہ ہائی اسکول کے میدان میں اجلاس ہوا۔ لیکن یہ عام کھلا جلسہ تھا جس میں ہندو اور سکھ بھی موجود تھے۔ حضرت

قائدؒ نے نظریۂ پاکستان کی وضاحت ایسے دلکش انداز میں فرمائی کہ سارا مجمع عش عش کر اُٹھا۔ جلسہ کے اختتام پر ہندو سکھوں نے اپنے مسلمان دوستوں سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں آپ کے قائدؒ سے لاکھ اختلاف سہی پر انہیں ہم مان گئے۔

تیسری مرتبہ قائدِ اعظمؒ کشمیر سے واپسی پر ۱۹۴۴ء میں پنڈی تشریف لائے۔ اس قیام کے دوران اُنہوں نے انجمن فیض الاسلام کے یتیم خانے کا معائنہ کیا۔ یہ یتیم خانہ قحطِ بنگال کے ہولناک ایام میں حضرت قائدِ اعظمؒ ہی کی اپیل پر بنگال کے قحط زدہ بچوں کی پرورش کے لئے جاری کیا گیا تھا جس وقت قائدِ اعظمؒ یتیم خانے کی عمارت میں پہنچے اُن کے استقبال کے لئے ہزاروں مسلمان جمع تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے یتیم خانے کے انتظامات کو سراہتے ہوئے پانچ صد روپے اپنی طرف سے پیش کئے اور فرمایا "میں انجمن فیض الاسلام کی انتظامیہ اور مسلم لیگی زعماء کو اُن کی اس قومی خدمت کے لئے مبارکباد دیتا ہوں جس کے ذریعے وہ بنگال اور دوسرے بے سہارا اور یتیم بچوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ برِصغیر کے مسلمان اب نہ صرف سیاسی لحاظ سے بیدار ہو رہے ہیں بلکہ اُنہوں نے قومی اور سماجی خدمت کے میدان میں بھی نمایاں کام شروع کر دیئے ہیں۔ اگر یہ بیدار کی سلسلہ جاری رہا تو مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے بلند اور پاکیزہ مقصد حصولِ پاکستان میں کامیاب

ہو جائیں گے۔"

چوتھی مرتبہ قائدِ اعظمؒ قیامِ پاکستان کے بعد پنڈی تشریف لانے کو تھے کہ لاہور میں دفعتہً اُن کی طبیعت علیل ہو گئی اور دورہ منسوخ کرنا پڑا +

شورش

یہ واقعہ اُن دنوں کا ہے جب برطانوی سامراج کے خلاف کانگریسی سوراج کی تحریک ہندوستان گیر پیمانے پر چل نکلی تھی۔ اصل میں یہ مسٹر گوکھلے کا زمانہ تھا اور اُن کی دیکھا دیکھی ہندو نیشنل کانگریس کو لیڈروں کی کھیپ وکیلوں کے قبیلے سے ملنے لگی تھی۔ اس اتفاق پر مزید حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ ہندو کانگریس کے بڑے سے بڑے لیڈر کی حیثیت ناکام وکیل سے زیادہ نہ تھی۔ گویا ناکام وکالت کا راس المال سیاست کی منڈی میں تھوک کے بھاؤ بکنے لگا۔ ہندو ذہنیت اگرچہ ازل ہی سے بھاؤ تاؤ اور مول تول کی عادی رہی تاہم بنیا لٹ بٹ مار کے باوصف بھارت بھومی کے پہاریشن آزادی کے سنگھاسن پر ہر ہارے ہوئے وکیل کا سواگت کرتے اور اُسے کم از کم

"مہا نما" بنا کر دم لیتے۔

چنانچہ جب انگریز دشمنی کی گھٹا زوروں سے گھر کے آئی اور آن کی آن میں چھا گئی تو اس برسات میں ڈھیروں وکیل نازل ہوئے جنہوں نے فن تقریر کی مشق کے لئے سیاسی سٹیج قبضا لیئے۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں راولپنڈی کے اندر بھی ایک اکھاڑہ گنجمنڈی میں تیار ہوا۔ اس زمانے میں منڈی کا نام "گنج منڈی" تھا۔ یہاں سیاسی نوعیت کے جلسے ہونے لگے۔ اُنہی دنوں ایک جلسے میں اجیت سنگھ نے اپنی مشہور نظم "پگڑی سنبھال اوئے جٹا" پڑھی جس سے جوش و خروش پھیل گیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ چند دنوں میں یہ آنی اور ہنگامی جوش ایک پرخروش ہنگامے کی صورت اختیار کر گیا اور اس ہنگامے کا نام "پلیڈرز رائٹ" یعنی "وکیلوں کی شورش" قرار پایا۔ وکیلوں کی ذات سے اس شورش کی نسبت وزن بیت سے زیادہ نہیں۔ وہ محض اس لئے معتوب ہوئے کہ سیاسی جلسوں میں تقریریں کر کے خالی خیالی آزادی بھگارا کرتے تھے۔ ہاروہاڑ اور قشتہ دائی کا پیشہ نہیں تھا لیکن تقریریں جھاڑنے کی قیمت اُنہیں بہت زیادہ ادا کرنی پڑی۔

ہوا یہ کہ جلسوں میں لگائی ہوئی آگ کے شعلے ایک روز بھڑک اُٹھے اور چند شورہ پشت ہندو ان شعلوں کو ہوا دینے لگے یہاں

غوغا آراؤں کا باوا آدم ایک شوریدہ سر ہندو مہاشہ منگل سین عرف "ٹنڈا" تھا۔ اس نے گلی کوچوں میں نعرہ بازی کر کے طوفان مچا دیا اور نومبر ۱۹۰۷ء کی ایک سہانی صبح پان سات سوایرے غیرے ساتھ لگا کر نکلا اور جلوس کی شکل میں روانہ ہوا۔

اس جلوس کے پیش نظر کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا۔ الّا یہ کہ مہاشہ منگل سین اپنے "ٹنڈ منڈ" ہاتھ کو ہوا میں لہراتا اور نعرے لگاتا ہوا کچہری روڈ کی طرف مارچ کر رہا تھا۔ راستے میں کئی زندہ دل تماشائی ہمرکاب ہو گئے اور جلوس کی تعداد "ہزاروں" تک پہنچ گئی دوپہر کا وقت ہو چلا تھا کہ لیاقت باغ کے قریب آن کر مہاشہ منگل سین کو عقل کی بات سوجھی اور اس نے اعلان کیا کہ ہم کو ضلع کچہری چلنا ہے۔ وہاں ہمارے راہنما وکیل صاحبان موجود ہیں ان سے مشورہ کے بعد ہم انگریز کو ملک بدر کرنے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس پُرمغز اعلان پہ لوگوں نے تحسین کے ڈونگرے برسائے اور فلک شگاف نعرے لگائے۔

القصّہ مہاشہ منگل سین کا یہ خیال غلط بھی نہ تھا۔ کہ فی الحال کچہری پہنچ کر وکلائے کرام کے ہاتھوں میں آزادی کا جھنڈا تھما کر دیش بھگتی کی چرخی گھما دینا چاہیئے کیونکہ یہ وکیل لوگ ہی کئی مہینوں سے تقریروں کے اندر سوراج طلبی کی ریہرسل کر رہے تھے۔

اُدھر وکیل صاحبان بالکل بے خبر بیٹھے تھے کہ بپھرے ہوئے جلوس نے کچہری کے احاطہ میں نزولِ اجلال فرمایا۔ بعد دوپہر کا وقت تھا۔ مقدمات کم و بیش نمٹ چکے تھے۔ شاید ہی کہیں کوئی اغوا یا قتل کا مجرم اپنی باری کا منتظر رہ گیا ہو۔ اتنے میں منگل سین نے بار روم ہی جا کر اپنے مرشدانِ گرامی کو نازک صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ شمعِ آزادی کے پروانے آج مرنے مارنے کی خاطر گھروں سے نکل آئے ہیں۔

قانون داں لیڈروں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر قیادت سنبھالنے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اس دوران بلوائی بھاشے نعرہ زنی کرنے اور عدالتوں کے شیشے توڑنے پھوڑنے میں مصروف رہے۔ اس اکھاڑ پچھاڑ کے وقت جج حضرات غسلخانوں میں چھپ گئے۔ فقط کسی بیچارے کو بلوائیوں نے لات گھونسہ مارا یا کسی اہلِ مد کے تھپڑ رسید کیا۔

کچہری کے متصل فرنگی نژاد ڈسٹرکٹ جج کا بنگلہ تھا۔ اس پر دھاوا بولا گیا اور اس کی میم صاحبہ کو بُرا بھلا کہنے کے بعد بنگلے کو آگ لگا دی۔ اس سے ورے مسٹر ڈی پی اگنا ڈپٹی کمشنر کا آفس تھا۔ بلوائی وہاں پہنچے تو اس نے بھاگ کر پونیس لائن میں پناہ لی۔ یہاں سے فتح مند قافلہ کمشنر بہادر مسٹر انیس برن کی کوٹھی پر پہنچا اور پتھراؤ کے بعد ٹینس کورٹ کے پردوں کو آگ لگانے

میں کامیاب ہوگیا۔

قریب ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ٹامکن رہتا تھا شور و شیون کی صدا سن کر وہ برآمدہ میں نکل آیا۔ بلوائیوں نے اس پر بھی پتھراؤ کیا۔ ؏

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

یہ تمام مایہ ناز "تاریخی کارنامے انجام دے کر بلوائی کامرانی کے پھریرے لہراتے شہر کی سمت کو کوچ کر گئے۔ راجہ بازار کی نکڑ پر پہنچ کر مشن اسکول کے متصل گرجا گھر کو نذر آتش کیا۔ پھر سید پور روڈ جانکلے اور راستے بہادر بوٹا سنگھ کے کارخانے پر یورش کی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ کارخانے کی مشینیں توڑیں۔ اس شکست و ریخت میں ایک بلوائی کا ہاتھ بری طرح زخمی ہوا۔ اتفاق سے بوٹا سنگھ وہاں نہیں تھا۔ ورنہ اس کے بوٹ اتار لے جاتے۔

الغرض چار پانچ گھنٹے شہر میں مہاشہ راج قائم رہا۔ مگر دن ڈھلتے ہی آنے والی عقوبت کے مہیب سائے قریب آ گئے۔ انچیف کمانڈر نے شہر کو گورا فوج کی تحویل میں دے دیا۔ راجہ بازار اور گنج منڈی میں مشین گنیں نصب ہوگئیں۔ جنہیں دیکھ کر مہاشے گھروں کو سدھار دیے۔ ؎

بہ بزم مے پرستاں محتسب خوش عزتے دارد
چو آید بر بمجلس شیشہ خالی می کند جا را

سورج غروب ہوتے ہی منگل سین کا ستارہ گہنا گیا اور اُنہیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ رات خوف و ہراس کو اپنے جلو میں لے کر آئی تھی۔ ڈرامے کا اصل ایکٹ نور کے تڑکے شروع ہوا۔ سحر کے جاگتے ہی وکیلوں کی پکڑ دھکڑ کا معرکہ گرم ہو گیا۔ ہنسراج ساہنی جو ایک مشہور وکیل تھا، سبزی منڈی سے گرفتار ہوا۔ اس کا منشی شیورام بھی دھر لیا گیا۔ مُرلی دھر، مِتّا داس اور گوواسرام وغیرہ وکلا اور اُن کے منشی بھی پکڑے گئے۔ وکیلوں کی خانہ تلاشیوں پر تجوریوں سے سینے کے پونڈ برآمد ہوئے۔

کچھ دنوں میں پنڈی کی تاریخ کے اس یادگار مقدمۂ بغاوت کی سماعت شروع ہو گئی۔ دہلی سے ایک ایڈیشنل جج اس مقدمے کی خاطر پنڈی بلایا گیا۔ ہنسراج ساہنی کے وکیل بیٹے بودھ راج ساہنی نے ملزموں کی طرف سے وکالت کی۔ ہفتوں سماعت جاری رہی۔ پیشی پر تماشائی بلوائی اور حلوائی ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے پکوڑے، ریوڑیاں، چنے جور گرم وغیرہ اشیا خوب فروخت ہوا کرتیں۔

آخر کار بحث کا دن آ پہنچا۔ یہ خاص بودھ راج ساہنی کا دن تھا۔ اس نے مسلسل کئی گھنٹے بحث کی۔ ایک مرتبہ غش کھا کر گر بھی گیا لیکن ہوش سنبھالتے ہی سررشتۂ بیان کو جاری رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جواں سال وکیل نے بڑے ہی منطقی استدلال

کے ساتھ وکیلوں کو اس شورش سے بری کرانے میں اپنی پوری طاقت لسانی صرف کردی اور جج کو باور آیا کہ وکیل لوگ اگرچہ اونچے پائے کا سیاسی مذاق رکھتے ہیں تاہم انھوں نے بلوے میں شرکت نہیں کی۔ بلکہ وہ اُس وقت بار روم کے کواڑ بند کر کے پیچھے بیٹھے رہے۔ یہ تو منگل سین ٹنڈا اور اس کے حواری تھے جو عدالتوں کے شیشے توڑتے رہے۔

المختصر وکیلوں کو دبوچنے میں استغاثہ ناکام رہا اور وہ فی الجملہ رہا کر دئے گئے۔ منگل سین اور اس کے دو چار حواریوں کو سات سات سال کی قید بامشقت سنائی گئی۔

مقدمہ ختم ہوا تو بودھ راج ساہنی کے نام کا جیکارا بلند ہونے لگا۔ راجہ پونچھ نے اس کو اپنی ریاست کا چیف جسٹس مقرر کیا۔

منگل سین ٹنڈا سات برس کے بعد رہا ہوا اور باہر نکلتے ہی اخبارات بیچنے کا دھندا شروع کر دیا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ہفت روزہ "خطیب" تک کی ایجنسی اس کے پاس تھی۔ تقسیم سے کچھ پہلے تک وہ زندہ و سلامت موجود تھا اور گلی کوچوں میں اخبار بیچتا پھرتا رہا۔ اپنی شورش پسند طبیعت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اخبار کی سرخیوں کو توڑ موڑ کر ایسی فساد انگیز ہانک لگاتا جس سے ہندو مسلم کشیدگی کے مسئلہ کو خاصی ہوا ملتی۔

اب کبھی کبھی سوچتے ہیں تو جی مسوس کر رہ جاتا ہے۔ یارب وہ صورتیں کس دیس بستیاں ہیں جن کے دیکھنے کو انکھیاں ترستیاں ہیں +

اُوم تت سَت

مہا سبھائی ثقافت کی الگ ایک شان تھی۔ اُن کے میلے ٹھیلے، تیج، بیوپار اور بینائی ہٹ مار سب کے سب انسانی فطرت کے عظیم شاہکار تھے۔ برس بھر کا ہر دن اک نہ اک دسہرے دیوالی ہولی رکھشا بندھن کا پیام لے کر آتا اور مندروں گلیوں بازاروں اور رہگزاروں میں راگ رنگ کا جلوہ بکھر جاتا۔ بعض موقعوں پہ نگر کیرتن ہوتے طبلے کھڑکتے سارنگی کی چیں چیں اور ساز کی آواز پہ گھلے بازیاں ہوتیں۔ بھادوں کی آخری تاریخوں میں جنم اشٹمی کے جلوس نکلتے جیسی جگادھری برہمن کے گھر پنگھوڑا ڈال کر اس میں کرشن جی کا چھوٹا سا بت لٹاتے اور جے جے کے جیکارے بلند ہونے لگتے۔ پھر اسی پنگھوڑے کو بہلی میں سجا کر جلوس برآمد کرتے اور بہلی کے آگے آگے

ایک برہمن وقفوں کے ساتھ بچے کے رونے کا سوانگ بھر کر بھگوان کے جنم دن کا ناٹک روپ دھارتا یہ جلوس باجے گاجے ڈھول تاشے کے ساتھ شہر کے بازاروں میں گھومتا اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر راگی بیراگی بھجن الاپتے۔ کسی اہم موڑ یا ناکے پر دین دھرم کے پرچارک تقریریں کرتے۔ اس طرح کم و بیش چھ سات گھنٹے تک دھیرے دھیرے رینگتا ہوا یہ جلوس کسی مندر کے دوارے پہنچ کر منتشر ہو جاتا۔

جنم اشٹمی سے زیادہ دسہرے کے موقع پر رام لیلا رچائی جاتی اور پورے دس دن بالمیکی رامائن کی کوتا سٹیج ہوتی۔ ہندو مسلمان سب شوق سے دیکھتے۔ دیوالی کی رات جگمگ کرتی آتی اور بام و در پر اُجالا بکھیر کر نکل جاتی۔ ہندو کہتے اس رات لکشمی دیوی کے پوتر چرن جس گھر جائیں بھاگ جگائیں اور دھن لٹائیں۔ اسی کارن دیپک مالا کے چانن میں بیٹھ کر جوئے کی بازیاں لگائی جاتیں اس شغل میں اوباش مسلمان بھی شریک ہو جاتے۔ ہندو اپنے تہواروں کی خوشی میں مسلمان دوستوں کے گھر بھی کھیل بتاشے اور مٹھائی بھیجتے۔

تہواروں میں بلاشبہ غریب گھرانے بھی ہوتے لیکن اُن کی مفلسی جگ ہنسائی کا تماشہ نہ بنتی۔ امیر اپنے غریب ہم جنسوں کی خفیہ امداد کرتے۔ بڑے بڑے مہاجن پی کر چھوٹے کو پاؤں پر کھڑا کر دیتے یا سماجی انجمنیں اس کی حیثیت کے مطابق کوئی دھندا

تلاش کرتیں۔ کچھ نہ ہوا تو آلو چھولے کا چھبیا لگوا دیتے۔ آپس داری کے معاملات سلجھتے کہ بے ضرورت بھی دھیلے پیسے کی چیز خرید کر لیتے ہوتے ہوتے وہی چھبیے والا ایک روز "زلف بنگال ہیر آئل" ایجاد کر کے پنڈی کا سب سے بڑا تجارتی ادارہ قائم کر لیتا۔ جہاں سو پچاس ہندو کارندے کھپ جاتے۔

مہاشے اپنے بچوں کی ضرورت سے زیادہ نگہداشت کرتے مسلمان بچوں کے ساتھ کھیلنے سے روکتے۔ اگر کوئی ہندو بچہ بگڑ جاتا تو بڑے بوڑھے اس کو مل کر سمجھاتے۔ نہ مانتا تو اس کی شادی کر دیتے۔ باپ اپنی دکان بیٹے کے سپرد کر کے خود فارغ ہو جاتا اور کہیں اوٹ میں بیٹھ کر اس کی حرکات اور سکنات کا جائزہ لیتا۔ کچھ دنوں میں وہی طفل برباد شدہ نمک کی کان میں گھس کر پورا نمک بن جاتا۔ بچے مولیا مڑھی بہتا۔

مہاشوں کے جو بچے ذہین اور محنتی ہوتے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے۔ وکیل اور ڈاکٹر بنتے۔ جو کچھ بھی بن نہ سکتے وہ سرکاری دفتروں میں کلرکی اختیار کر کے ہیڈ کلرکی کے زینہ سے اوپر چڑھتے چڑھتے افسری تک جا پہنچتے۔ وہ کوشش کرتے کہ جس فن کو اپنائیں اس میں کمال حاصل کر دکھائیں۔ ادھوری زندگی کے قائل ہی نہ تھے۔ وکیل ہوتے تو ایسے کہ اُن کی قانونی موشگافیوں کے لطیفے کچہری کے بار روم میں آج تک دہرائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بن کر نکلتے تو

میٹھی زبان کے ساتھ جنتا کی سیوا کو اپنا دھرم خیال کرتے کہا کرتے کہ سکول ٹیچر اور ڈاکٹر کا کوئی مذہب نہیں جیسا شاگرد ویسا اُستاد۔ جیسا مریض ویسا ڈاکٹر ہونا چاہیئے۔ امیر اور غریب کا اس پیشے والے کم ہی امتیاز کرتے۔

تاجر پیشہ ہندو اپنی سماج میں روپے پیسے کی وجہ سے اُونچا پایہ رکھتے۔ فلاحی اداروں کو دل کھول کر چندہ دیتے۔ لائبریریاں اور مسافر خانے انہی کی امداد سے چلتے۔ پاٹ شالوں کے باہر پانی کی سبیلیں لگواتے۔ مسلمان بھی چاہتا تو اُسے پانی پلا دیتے لیکن اس ڈھنگ سے کہ کھوکھلے بانس کی نلکی کے ایک سرے میں انڈیلتے اور مسلمان اوک سے پی لیتا۔ یہ تکلف اس لئے ہوتا کہ مسلوں کی چھوت نہ لگ جائے۔

جینی ہندو چھوت چھات کا بہت خیال رکھتے۔ ان کی عورتیں بازار میں گھونگھٹ نکال کر نکلتیں اور مسلمانوں کو نشٹ جان کر سائے سے بھی گریزاں رہتیں۔ چاٹ والوں سے مسلمان کچھ خرید کرنے جاتا تو بے رُخی کے ساتھ کاغذ پر سودا رکھ کر خریدار کے ہاتھ پر دُور سے چھوڑ دیتے جیسے مُردار چوہیا کو نالی میں پھینکتے ہیں۔ مسجدوں سے اذان پڑھنے کی آواز آتی تو اپنے کم سن بچوں سے کہتے کوئی شخص لکڑیاں بیچ رہا ہے۔ اصل میں مسلمانوں کے مذہب سے متعلق کوئی بات ہی کان میں پڑنے نہ دیتے تھے۔

مخلوط آبادیوں میں ہندو اور مسلمان بچے کھیل کود میں شریک ہوجاتے کھیل کھیل میں دنگا بھی ہوجاتا۔ ظاہر ہے کہ فرزندانِ توحید ہاتھ کے تیز اور مار پیٹ میں یگانہ تھے۔ بنئے پٹ پٹ مار کھا کر گھروں کو سدھارتے تو ان کی مائیں چوبارے کی کھڑکی میں کائیں کائیں کرتی ابھر آتیں۔ لیکن غصے میں کوئی بات چر چر کرنے کے علاوہ سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن جب کواڑ چٹاخ سے بند کرتیں تو مسلمانوں کے بارے میں من حیث القوم ایک غلیظ گالی سننے میں آتی۔ بچوں کے جھگڑوں میں مرد غیر جانبدار رہتے۔ اس ضمن میں "کھتری بدھ" اور "بنیا چال" مشہور اصطلاحیں تھیں۔ کسی سے بدلہ لینا ہوتا تو اس کے بیٹے کو پتنگ دلوا دیتے تاکہ چھت پر چڑھ کر پڑھائے اور . . . . . !

ہندوؤں کے رہائشی مکان بنکوں کی طرح خوبصورت ہوا کرتے اس مشترک خوبصورتی کا راز یہ سمجھئے کہ دونوں کی بنیادوں میں ہتھکاری اور سود خواری کا مسالہ پلایا جاتا ہے۔ خوبصورت بنک تو حال کی تخلیق ہیں لیکن ہندوؤں کے عالی شان ایوانات لیاقت باغ سے لے کر اصغر مال تک پھیلے ہوئے تھے۔

کسی مہاجن کی جان پر بن جاتی تو ہزاروں راز تن میں اٹھا دیتا ——— ہے تو لطیفے کی سی بات مجھے یہاں یاد آ گئی۔ اس لئے دہرانے میں مضائقہ نہیں۔ کسی وکیل کی لڑکی مہاجن کے گھر کی بہو بن گئی۔ مہاجن انتہائی جز رس تھا۔ بہو نے ایک روز دیکھا کہ چوکے میں

بیٹھا بھوجن کھا رہا ہے۔ گھی کے ڈولے میں مکھی گری اور وہیں اٹک کر رہ گئی۔ مہاجن نے مکھی کو پکڑ کر اس کے پاؤں اور پروں سے گھی نچوڑ لیا۔ بہو نے یہ منظر شاید میکے میں دیکھا نہ تھا۔ دل میں کہا ہائے کس گھر میں آ گئی۔ دن بھر اسی خیال میں نکلا۔ رات جب آدھی گزری تو اس نے پیٹ درد کا سوانگ رچا یا اور ایسی اداکاری کی کہ سارا کنبہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مہاجن نے پوچھا بہو رانی تجھے پہلے بھی ایسا درد ہوا تھا کبھی۔

بہو بولی —— ہاں چڑھے چاند کتنی بار ہوا ہے

مہاجن —— تو پھر کس دارو سے تیرا روگ کٹتا تھا۔

بہو —— میرے پتا جی موتی پیس کر پلا تے تو آرام آجاتا۔

مہاجن اٹھا اور شتابی سے تجوری کھول کر میلی چیکٹ تھیلی اٹھا لایا اور اپنی ہتھیلی پر الٹ کر کہنے لگا بہو رانی اگر موتی تیرے لئے امرت جیوتی ہیں تو میں اب یہ سارے گھوٹ کر تجھ کو پلاتا ہوں۔

کہاں وہ بے نمکی کہاں یہ شور اشوری۔ بہو اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوچھا بھلا بتاؤ تو آج گھی کے ڈونے میں مکھی کیوں نچوڑی تھی۔ مہاجن ساری واردات سمجھ گیا اور کہا بھورانی تو میرے گھر کی لچھمی ہے۔ شاید تو نہیں سنا کہ مکھی چوس لے اور موتی پیس لے۔

اس رنگ کے قصے مہاجنوں کی جز رسی کے گھڑے ہوئے فسانے نہیں تھے۔ ان میں حقیقت بھی تھی۔ ایک لکھ پتی صراف

ٹھنڈی شاہ اپنی جھلار سے صبح سویرے نہا دھو کر آتا۔ راستے میں کسی خوانچے والے سے گرما گرم حلوا خرید کر کھاتا اور کاغذ پر لگے گھی کو اپنے سر کے بالوں میں "تازگی پہنچانے کے لئے" گھس لیا کرتا۔

توہم پرستی ان میں عام تھی۔ پوجا پاٹ کے بے شمار طریقے تھے۔ جین مندر میں ایک گروہ ننگے کی پوجا بھی کرتا تھا۔ ساون کے دنوں میں چوہڑے چپاڑے اپنے گوگے پیر کا دن مناتے اور لمبی چھڑ پر سانپ کی طرح رسی مروڑ کر باندھتے اور اس کا پھن پھیلا کر جلوس نکالتے۔ ہندو اس چھڑ پر بھی نذریں چڑھاتے۔ اصل میں سانپ پوجا کی یہ ایک شکل تھی۔

مہاشہ گھر سے نکلتا اور راستہ میں کارِ قضا کوئی برہمن نظر آجاتا تو اس کی پوترتا کے باوجود منحوس خیال کر کے گھر لوٹ جاتا۔ اگر بھنگی ٹوکری سمیت ملتا تو دل ہی دل میں بھگوان کے سیس نواتا اور سمجھتا آج سب کام شدھ ہو جائیں گے۔ اگر کوئی راہ گیر چھینک لیتا اسے نحس خیال کرتے۔ ایک محاورہ بنا رکھا تھا۔ "نچھیاں کھائیے۔ نچھیاں لائیے۔ نچھیاں کسے دے گھر نہ جائیے بھاویں اگ لگی ہووے۔ یعنی بجھانے کے لئے بھی نہ جاوے۔

تیسری کا چاند نہیں دیکھتے تھے۔ اگر اتفاقی نظر پڑ جائے تو جس طرح اندھا کتا ہوا پر بھونکتا ہے۔ کنکر پتھر اٹھا کر چاند کی سمت پھینکتے۔

کوئی پہلوان کسی سے بھڑ جاتا یا گرما گرمی ہو جاتی اور تماشائی بھی جمع ہو جاتے تو کمزور پہلوان بڑے غصہ میں طاقت والے سے جان چھڑا کر باہر کو بھاگتا اور کہتا۔ بیٹا جانا مت میں ابھی ڈنڈا لے کر آتا ہوں۔ اس بہانے ایسا جاتا کہ کبھی لوٹ کر نہ آتا۔

حلوائی سے کسی کی تکرار ہو جاتی تو وہ اپنے نوکر کو پکارتا ـــ لا تو ذرا میرا پونا ـــ پونا کڑاہی صاف کرنے والے کپڑے کو کہتے تھے۔ لیکن لہجے کے تیور سے معلوم ہوتا جیسے بندوق منگوا رہا ہے۔

بہت مدت کی بات ہے گوالمنڈی کے ریلوے پل کے نیچے موڑ پر تانگے ٹم ٹم اور یکے سڑک کی ناہمواری یا موڑ کی خامی کے باعث اُلٹنے لگے۔ ہندو سماج میں چرچا ہونے لگا کہ کسی نٹ کی آتما نے اس جگہ قبضہ جما لیا ہے۔ اس افواہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ پیدل چلنے والے بھی اپنی دھوتی کے کنارے سنبھال کر نکلا کرتے کہیں نٹ کھٹ آتما گردن پر سوار ہو کر مشق ناز نہ کرے۔ تو پوربی تیرہ چوکے والا محلہ وارہ بند۔ وقت پر بھی ٹھاٹ سے بیٹھتا۔ کسی غیر کا سایہ بھی چوکے میں پڑ جاتا تو روٹی نہ کھاتے۔ مرگھٹ جاتے تو ارتھی جلا کر واپس آتے ہی اشنان کرتے تا کہ مُردہ چمٹ نہ جائے۔ کوئی مہاجن اسّی سے اوپر عمر پا کر مرتا۔ اس کی ارتھی باجے گاجے کے ساتھ لے جاتے روپے پیسے نچھاور کرتے۔ کندھا دینے والے ٹھٹھا مذاق کرتے ہنستے

کھیلتے اور لاش اُٹھانے نہ دیتے تھے۔ گویا بوڑھے کی موت کو ماتم نہیں جانتے تھے۔

وقت کی پیمائش گڑویوں اور لوٹوں کے پیمانوں سے کیا کرتے۔ مانجھتے مانجھتے جب گڑوی لوٹا ٹوٹ جاتا تو اس سے حساب لگاتے کہ بھگوان رکھے مراری لال پانچ برس کا ہو لیا۔ یہ گڑوی تب خریدی تھی جب اس کا منڈن سنسکار کیا تھا۔

لباس اُن کے سادہ سادہ ڈھیلے ڈھالے ہوا کرتے۔ سردیوں میں بعض حضرات گرم کوٹ پر لٹھے کا ایک غلافی چولا پہن لیتے تاکہ کوٹ میلا نہ ہو جائے۔

خوراک اُن کی دہی بھلے، پکوڑے، چاٹ چٹنی وغیرہ اشیاء تھیں۔ جلیبی تو سرخ رنگ کی کوئی بھی چیز نہ کھاتے۔ کیونکہ ماس کی ہم رنگ ہر شے اُن پر حرام تھی۔ جاوا کی سفید چینی بھی استعمال نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کے خمیر میں ہڈیوں کا بھیارا رچا ہوتا۔ اس کی جگہ بورا کھانڈ استعمال کرتے ـــــ لیکن دیکھتے دیکھتے زمانہ بدل گیا۔ سکھوں کی رفاقت نے بُری عادت ماس کھانے کی ڈال دی۔ جہاں پرشاد کے ہوٹل کھلنے لگے۔ انڈے کا نام "رام لڈو" رکھ لیا۔ مچھلی کو "جل توری" کہنے لگے۔ زبان کی چاٹ بُری بلا ہے۔ بڑے چاؤ سے مسلمان دوستوں کی دعوتوں میں بن بلائے بھی جانے لگے۔ پرانے پرانے ہندوانی پود کا تماشہ دیکھتے کڑھتے اور کہتے کل جگ ہے، نہارا ج

کل جگ تو بہ تو بہ چھی چھی چھی ۔۔۔!

مثل مشہور ہے بیٹے کی کمائی مکان اور بیاہ نے کھائی۔ بیاہ شادی میں راس دھاری بلائے جاتے۔ بعض اُمرا کے یہاں رنڈیوں کا مجرا بھی ہوتا۔ ویسے بیشتر گھرانوں کی لڑکیاں راگ رنگ ناچ گانا سیکھتیں تاکہ پتی دیو کا دل لبھائیں۔

مہاشے صبح کی سیر پابندی سے کیا کرتے۔ اُجالے سے پہلے دو دو تین آدمی مل کر نکلتے۔ باتیں کرتے اور سیاست بگھارتے جاتے کہا کرتے سیر کو نکلو تو کبھی تنہا نہ ہو۔ تپسیا کے لئے جاؤ تو کوئی ساتھ نہ ہو ۔۔۔ موسم گرما میں بہتیرے مسلمان سڑک کنارے چارپائیاں بچھائے لذتِ خوابِ سحر کا لطف اُٹھاتے نظر آتے۔ سورج سوا نیزے پر آجاتا تو آنکھیں ملتے بیدار ہوتے۔ سیر کے ہنگام پوتے نے دادا سے پوچھا "اتنا دن نکل آیا۔ پر مسلے ابھی تک سوئے پڑے ہیں" دادا نے کہا "رامو اُونچا مت بول۔ یہ سوتے ہی رہیں تو اچھا ہے۔ کاکا جی اگر کبھی یہ جاگ لئے تو اپنی جان کی خیر نہیں۔"

سیر کے لئے مرد ہی نہیں ہندو دیویاں بھی سانجھ سویرے ٹولیاں بنا کر نکلتیں۔ جوانی میں ہم گھاٹ لگا کر ان کی باتیں سُنا کرتے۔ گھریلو قسم کی ہلکی پھلکی باتیں یعنی گوبھی پکائی نمک زیادہ ہو گیا رام رکھی نے "دل کی پیاس" کا جمپر سلوایا۔ مگر ناک چوڑی کر ذرا

نہیں سمجھتا۔ دیوی دیال کی بہو فنڈ رہے تین سال ہوئے ابھی پھوٹی نہیں۔ ساون بھادوں میں کوشلیا کے گھر خوشی ہو گی۔

عوامی تفریح میں آلا اودل کے سُننے سنانے کا رواج تھا۔ جسے تال سُر کے ساتھ گاتے۔ رات دیر تک اس کی بیٹھک رہتی۔ اس میں دو خاندانوں کی لڑائی اور کسی کی شادی کا بیان تھا۔ اصل میں یہ داستان پاستان رزمیہ غنائیے کی صورت میں کسی چالاک کوی نے ہندوؤں میں جنگ وجدل کا جذبہ اُبھارنے کے لئے لکھی تھی۔ لیکن اسلامی جہاد کی رُوح کہاں اور یہ کہاں۔ گنگا جل میں زمزم کا رنگ کیوں آنے لگا۔ اور پھر نعرۂ تکبیر کی گونج "دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" کی مثال تھی۔ کوئلہ سنٹر میں ایک کمزور دل حلوائی فسادات کے دنوں میں تکبیر کے ایک ہی فلک شگاف نعرے کی صدا سن کر جاں بحق ہو گیا ؎

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

چلتے ہو تو چمن کو چلئے

پنڈی کے بارے میں ایک کہاوت ہے "موسم کا اعتبار نہیں زمین ہموار نہیں۔ درخت پھلدار نہیں ـــــ اس کے باوصف سبزہ و گُل کی فراوانی ہے۔ چھوٹے موٹے باغ باغیچے بھی موجود ہیں۔ اگرچہ وقت اور حالات نے اُن کی صورت بگاڑ دی۔ پھر بھی اُن کا وجود باقی ہے "سرداروں کا باغ" ایک متمول سکھ سردار سوجان سنگھ کی فارغ البالی اور دَورِ خوشحالی کی یادگار ہے۔ اس میں خاصی بڑی لائبریری تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان کے وقت ان کتابوں سے ایندھن کا کام لیا گیا۔ علم و فن کی سرپرستی اسے کہتے ہیں ؏

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

سردار سوجان سنگھ کے اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس کا ورثہ اس کی بیٹی

کے دو لڑکوں سردار موہن سنگھ سوہن سنگھ کو ملا۔ ان کے مال و منال اور جائداد کا یہ حال تھا کہ کھڑی ریاست کے بغیر بھی کسی مہاراجے سے کم سمجھے نہ جاتے۔ اُن کے گھر کی مستورات مرگ و شادی میں شرکت کے لئے برقعہ پہن کر نکلا کرتیں۔ سوہن سنگھ سیر و تفریح کے لئے انگلستان گیا تو داڑھی کیس وغیرہ صفاچیٹ کرادیئے۔ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اس کے ایک لڑکے کی شادی مہاراجہ جیند کی بیٹی سے ہوئی۔ کئی روز جشن بپا رہا اور پانی سے زیادہ شراب بہائی گئی۔ ینیسڈاؤن گارڈن میں معزز مسلمانوں کی دعوت علیحدہ ہوئی۔ اس میں بھی ناؤ نوش کی بزم گرم رہی۔ اس کا ایک بیٹا انگلستان میں مرا۔ لاش یہاں لانے کے لئے ہوائی جہاز خریدا اور کریا کرم کے بعد جہاز کو بھی جلا دیا گیا۔ یہ تھے امیری کے چونچلے اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ۔

شہزادہ کوٹھی ان رئیس بھائیوں کی رہائش گاہ تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں ان کا بار روم اور کتب خانہ دیکھا ہے۔ ۴۷ء کے فسادات میں جب یہ کنبہ دہلی بھاگا تو گھر بار کے ساتھ مسکرات کی سینکڑوں بوتلیں اور ہزاروں کتابیں لٹ گئیں۔ لیکن ان کا خفیہ خزانہ عمارت کی کسی دیوار میں محفوظ رہا۔ ۴۸ء کے آغاز میں دونوں حکومتوں کے مابین سرکاری سطح پر کوئی بات چیت ہوئی۔ سردار موہن سنگھ ہوائی جہاز سے پنڈی آیا اور خان قربان علی خان نے جو ان دنوں آئی جی پولیس تھے اپنی نگرانی میں موہن سنگھ کی نشان دہی پر خزانہ برآمد کر کے حوالے کیا۔

ایک اور باغ جسے اب لیاقت باغ کہتے ہیں۔ پہلے اس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی کی نسبت سے کمپنی باغ تھا۔ سیر و تفریح کا عوامی مرکز ہونے کے علاوہ سیاسی تحریکوں کی آواز بھی اس کے کھلے میدانوں میں مدتوں گونجتی رہی۔ اب اُن تحریکوں کی غیر مرئی یادگاریں اس باغ کے سبزہ زاروں میں نقش ہیں گویا اس باغ کی تقدیر میں کلیوں اور غنچوں کے رنگ و بُو کے علاوہ سیاسی نعروں کا رس بھی شامل ہے۔

لیاقت باغ کا اصل سہاگ ہمیشہ سے وہ افراد رہے ہیں جن کو گزر اوقات کے ذرائع کا خود بھی علم نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیبی رزق پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ کھلی ہوا اور کشادہ دھوپ کا لطف کچھ انہی کے حصّہ میں آیا ہے۔ ان میں سے اکثر باکمال جیب تراشی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ دن میں ایک آدھ بار اگر بازار کا چکر لگا آئیں تو لوگوں کے جیب و داماں میں چاندنی بھر جاتی ہے۔

ان کے علاوہ بہتیرے ذہین اور فخرِ خاندان طلباء ایسے ہیں جو علم کی دولت حاصل کرنے کے واسطے صبح سویرے گھر سے سکول کی جانب روانہ کئے جاتے ہیں لیکن وہ مشاہدۂ فطرت کرنے کی خاطر اس باغ کے سایہ دار درختوں کی اوٹ میں آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ حکیمِ اُمّت نے انہی کے بارے میں فرمایا تھا ع

خوش تراں درسے کہ گیری از نظر

اس باغ کے اندر مرحوم لیاقت علی خاں کی یاد میں ایک بارہ دری

تقریباً بارہ مرتبہ تعمیر ہوئی اور گرائی گئی۔ تقریب اس تخریب کی یہ ہوئی کہ بارہ دری کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دانش وروں کے درمیان تنازعے بپا ہوتے رہے۔ کچھ اہل رائے نے کہا کہ بارہ دری وہ ہے جس کے بارہ دروازے ہوں۔ کچھ نے کہا کہ بارہ دری کے اندر بارہ دریاں بچھائی چاہئیں تاکہ لوگ آرام و سکون کے ساتھ بیٹھ کر تاریخ ماضی کے دلنشیں واقعات پر روشنی ڈالیں کہ اس باغ میں کیسے کیسے روشن دماغ سیاست دان آزادی کا چراغ جلانے کے لئے آتے رہے۔ کانگریس کے جلسے اور خلافت کانفرنسیں ہوئیں۔ مذہبی مباحثے بھی اس باغ کے روزمرہ میں مدتوں شامل رہے۔ آخر آخر مسلم لیگ نے بھی یہاں اپنے جھنڈے گاڑے اور رہاں مرحوم لیاقت علی خان بھی یہاں تقریر ہی کرنے آئے تھے۔

لیاقت باغ کے عقب میں لئی کے کنارے کنارے جہاں آجکل گوالمنڈی کا مشہور محلہ "آنند پورہ" آباد ہے، موتیا باغ کے نام سے ایک خرابہ تھا جو سکھوں کی ملکیت تھا۔ لوگ اس کے قریب سے دن کے وقت بھی گزرتے ہوئے ڈرا کرتے کیونکہ اس اجاڑ فضا میں بھوت پریت اور چڑیلوں کی خوفناک آوازیں گونجا کرتیں۔ بالآخر سکھ مالکان نے یہاں آبادی کا منصوبہ بنایا اور اس کے قطعے بنا کر بیچ ڈالے۔ دیکھتے دیکھتے عالی شان مکان بننے لگے۔ اور آنندہ پورہ کے نام سے یہ بستی بس گئی۔ سکھوں نے کسی مسلمان کے

کے ہاتھ کوئی ٹکڑا زمین کا عمداً نہیں بیچا۔ لیکن خدا کی شان ہے۔ ابھی مکانات کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۴۷ء میں دفعتہً ہندو سکھ رعانہ ہو گئے۔ احمد جن مسلمانوں کو آنندہ پورہ کے گلی کوچوں سے خوانچہ تک لے کر گزرنے کی اجازت نہ تھی وہی ان مکانوں میں آباد ہوئے۔

مال روڈ پر جہاں کنٹونمنٹ آفس کی موجودہ عمارت کھڑی ہے یہاں پہلے ایک خوبصورت باغ تھا جس کا نام لینسڈاؤن گارڈن تھا۔ اسی کے ایک حصّہ میں دو سینما بھی تھے۔ موجودہ "اوڈین" سینما کا نام اُن دنوں لینسڈاؤن سینما تھا۔ عرفِ عام میں اس کو ناچ گھر کہتے تھے۔ دوسرا سینما جو اب "پلازہ" کہلاتا ہے پہلے اس کا نام "الفنسٹن" تھا۔

پُرانے باغ کی جگہ اب برائے نام ٹکڑا رہ گیا ہے۔ جہاں عیدین کی نماز ہوتی ہے۔ یا ہیپی جوڑے بیٹھ کر چرس پیتے ہیں اور انگریزی بولنے کی مشق کرنے والے پاکستانی اُن سے بہروں مصروفِ گفتگو پائے جاتے ہیں۔ ویسٹریج (جس کا نام نئی چھاؤنی تھا) ایک نشیبی گوشے میں کوئینز گارڈن ایک چھوٹا سا خوشنما باغیچہ تھا جس کے رکھ رکھاؤ اور آرائش میں مغربی ذوق جھلکتا۔ یہ موجود تو اب بھی ہے لیکن آئینہ بادِ بہاری کا زنگار معلوم ہوتا ہے

دورِ ایوبی میں جس ویرانے کو ایوب نیشنل پارک کا نام دیا گیا ہے پہلے اس کو ٹوپی رکھ کہتے تھے کیونکہ یہاں ٹوپیاں اچھلتی تھیں

خال خال کسی صاحبِ حال کی موٹر گاڑی خراماں خراماں نظر آیا کرتی یا پھر چڑھے چاند کوئی پارٹی پکنک منانے آتی اور اس ویرانے کے سکوت میں گھڑی دو گھڑی کے لئے ارتعاش پیدا کر کے نکل جاتی۔

اہلیانِ بنڈی کا اپنا ایک تفریحی مزاج تھا جو فصلِ بہار۔ سبزہ زار یا نغمۂ آبشار کا پابند نہیں تھا۔ لوگوں کی دلچسپی کے ناوسئے محدود تھے لیکن جاندار تھے اور ان میں خوش باشی اور زندہ دلی کو بڑا دخل تھا۔ اس تفریحی مزاج کو سمجھانے کے لئے میں دو واقعے عرض کروں گا جو ایک کنوئیں سے متعلق ہیں۔ آپ ملاحظہ کیجئے کہ کنوئیں کی تہہ سے مسرتوں کا فوارہ کس طرح ابلا۔

کم و بیش چالیس برس ہوتے ہیں۔ ایک شریف چور نے کسی دکان سے قیمتی گھڑیاں چرائیں اور پوچھ گچھ کے ابتدائی مراحل ہی میں خوفزدہ ہو کر مسجد بافندگان کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیں۔ لیکن پولیس نے جب تفتیش کا ڈول ڈال کر چرخی گھمائی۔ کچے چور نے قبول دیا کہ گھڑیاں چونکہ دائرہ پر دوش تھیں اس لئے فلاں کنوئیں میں گرا دی ہیں۔ اب پولیس کی قیادت میں غوطہ خور اور ڈوبے جائے واردات پر پہنچے۔ کچھ دیر میں آس پاس کے ان گنت خوش فکرے بھی جمع ہو گئے۔ کیونکہ قومی زندگی میں اس نوعیت کے ایامِ تفریح کبھی کبھار ہی آیا کرتے۔

کنوئیں میں بلا کا اندھیارا تھا۔ کوتوال نے سرچ لائٹ کا انتظام

کیا اور اُوپر سے بغور جھانک کر دیکھا تو کنوئیں کی تہہ میں "پانی تارا" سا نظر آیا۔ اس دن لوگوں کو باور آیا کہ اُستاد ذوق سے لے کر اُستاد یوسف ظفر تک جن شعراء نے بھی محاکاتی شاعری کی ہے وہ عمیق مشاہدہ پر مبنی ہے۔

ابتدائی چھان بین کے بعد دو غوطہ زن کنوئیں کے بیچ اُتارے گئے اُنہوں نے طول عرض اور عمق کا جائزہ لینے کے بعد پکار پکار کر یہ خبر اُوپر بھیجی کہ پانی یخ ہے اور بہت گہرا بھی۔ زمین پر پاؤں نہیں ٹکتے۔ ہمیں اس برف خانہ سے نکالئے ورنہ ہمارے کلمہ کے گواہ رہیئے۔ آخر غوطہ خوروں کا یہ ناکام وفد اُوپر بلوا لیا گیا۔

اب چند دانش ور جو گھر سے روٹی کھا کر دوسروں کو مفت مشورہ دیتے ہیں آگے بڑھے اور کوتوال سے کہا کہ غوطہ خوروں کو اگر برانڈی کا ایک پیالہ دیا جائے تو سردی کی شدت سے محفوظ رہیں گے اور بدن میں حرارت کے ساتھ قوتِ کار بھی بڑھ جائے گی۔ مگر یہ منطقیانہ استدلال کوتوال کی عقل میں نہیں آیا۔ چنانچہ گہرے غور و خوض کے بعد یہ قرار پایا کہ اگر کنوئیں کا سارا پانی یک قلم نکال دیا جائے تو گوہرِ مقصود ہاتھ آجائے گا۔ اس پر مضبوط قسم کے ڈول اور سرکاری بیل مہیا کرنے کا فیصلہ ہوا اور پولیس والے غوطہ خوروں کو لے کر چل گئے

اگلے روز مشتاقانِ دید کا تانتا بندھنے لگا۔ وہی چاٹ ریڑی

گزک والے بھی آ گئے۔ ایک صاحب جگت چچا تھے۔ عمرالدین اُن کا نام تھا۔ وہ اپنا حصّہ بھروا کر کنوئیں پر لے آئے اور بوریا بچھا کر ٹک گئے تھوڑی دیر میں اُن کے گرد حلقۂ اربابِ ذوق بن گیا۔ گھڑیوں کے نئے ماڈل، موجد کا شجرۂ نسب اور ماہر گھڑی سازوں کے کارناموں کے دفتر کھل گئے۔ بیلوں کی شاہی نسل اور اُن کی افزائش کے بارے میں قیمتی راز فاش ہونے لگے۔ کنواں کھدائی کے فنِ لطیف سے لے کر کوچۂ چیلاں کی کھاری باؤلی تک معلومات افزا قصّے بیان ہونے لگے۔

کافی دن چڑھے کو قوالِ شہر کی معیت میں مردانِ کار کی ٹولی جائے وقوع پر نمودار ہوئی۔ بیلوں کے گلے میں چمکیلی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ جب سر کو ہلاتے تو سُرتال کنوئیں کے پاتال تک گونجنے لگتا۔

خدا خدا کر کے کام کا آغاز ہُوا اور پانی کی نکاسی کا تماشہ شروع ہو گیا۔ پانی کا ڈول ڈالا جاتا اور ایک آدمی بیلوں کی جوڑی کو سڑک کے رُخ پر ہنکا لے جاتا۔ اس طرح پانی کا ڈول ڈول نکلتا اور دریا دریا بہتا چلا گیا۔ اندازہ ہے کہ پہلے ہی روز کئی لاکھ کیوسک پانی کا اخراج ہُوا۔

گمان ہوتا شاید طوفانِ نوح والا تاریخی کنواں یہی رہا ہو گا۔ کچھ بھی ہو۔ طوفانِ نوح بھی آ کر ایک روز تھم گیا تھا۔ مگر اس کنوئیں کا ذخیرہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کئی روز اس رنگ سے نکلنے

یعنی صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا —— رفتہ رفتہ تکمیل کار کا راستہ کچھ عیاں ہوا۔ پانی کی جگہ کیچڑ اور کیچڑ میں آمیز رنگا رنگ اشیاء برآمد ہونے لگیں۔ حقے اور گڑ گڑیاں کپڑے کی گڑیاں اور ٹونے ٹوٹکے چھو چھکے والے خانہ ساز بُت جن کے سینے میں لوہے کی سوئیاں آویزاں تھیں۔ گویا شوہر کو مطیع اور دشمن کو ہلاک کرنے والے سارے آلات برآمد ہوئے۔

یہ گراں مایہ تحفے شاید نہ نکلتے اگر وہ شریف چور اپنا جوہر اس آئینہ ہستی میں شامل نہ کر دیتا۔ ہر عمل کے ظاہری محرکات کے علاوہ قانونِ قدرت کی غیر مرئی تدبیر ہوتی ہے جو ہر آن حرکت میں رہتی ہے۔ اس کو اصطلاح میں قوتِ مدبرہ کہتے ہیں۔ خانہ تلاشی اور اس کی یادداشت سے بچ نکلنے کے لئے وہ باکمال اپنے نامۂ اعمال کو کنوئیں کے بیچ ڈال گیا تھا اُس کا بظاہر یہ حقیر سا عملِ صالح اتنا مفید ثابت ہوا کہ لگے ہاتھوں اندھے کنوئیں کی صفائی ہو گئی مگر ظالم قانون نے اس چور کو سرکاری مہمان خانے پہنچا دیا۔ کاش لوگ احسان فراموش نہ ہوتے تو اپنے محسن کی قدر کرتے اور دیدہ بوسی کے لئے آتے۔ مگر اس قصّہ کو گولی ماریئے میں آپ سے اس کنوئیں کی ایک اور داستان کہوں گا۔

چند دنوں میں کنوئیں کے اندر تازے پانی کی افراط ہو گئی گرمی کا زمانہ آگیا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے والے بکثرت رجوع کرنے

لگے۔ گھڑیوں کا فسانہ لوگوں کو تقریباً بھول گیا۔ ویسے بھی عوام الناس کا ہاضمہ اتنا خراب نہیں ہوتا۔ جتنا دماغ کمزور ہوتا ہے۔ نسیان کی یہ بیماری افراد تک ہی محدود نہیں۔ قومیں بھی اس کا شکار پائی گئی ہیں۔ مثلاً اعداد و شمار کے لحاظ سے اگر ایک لاکھ بہو بیٹیاں دشمن نے اغوا کر لیں تو ان حساب دانوں نے صرف پچاس ہزار مان کر دیں اور پھر مکانوں اور فیکٹریوں کی الاٹمنٹوں کے چکر میں ایسے کھوئے گئے کہ بس دھوئے گئے۔ اگر غیرت ہوتی تو اس کماری تک نعرۂ تکبیر کی گونج سنائی دیتی۔ مگر ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم سے کیا حاصل۔ جو قومیں ترقی کی راہ پہ گامزن ہوتی ہیں۔ وہ صرف آنے والے دور کو دیکھتی رہیں۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا تو قدامت پسندوں کا شیوہ ہے۔

اور اس وقت ہمارے پیش نظر ایک کنواں ہے جو بافندوں کی مسجد میں واقع ہے۔ پڑوس میں ایک بین الاقوامی نوسرباز خان نے چینی کی آڑھت کھول رکھی تھی۔ اس مردِ باصفا کو یہ خصوصیت حاصل رہی کہ پشتینی حرام خور ہے بلکہ حرام کاری کے بحرِ ذخار میں تیرنے والی صدف ہفت رنگ کا گوہرِ یک دانہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ شہاب ثاقب کی پشت پہ زینہ لگا کر فلکِ ہفتمی کے اُس بامِ بلند پر کمند پھینک سکتا تھا جہاں سے ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ستارہ خارج المرکز ٹوٹتا رہتا ہے۔ مگر آپ کو اس فلسفہ رانی سے کوئی روحانی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لئے میں آپ

کو اصل خبر سناتا ہوں ۔ ہٹلر کی جنگِ عظمیٰ کے دوران جب چینی کے نرخ پیارے ہو گئے بلکہ اس جنسِ شیریں کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کی جان امتحان میں پڑ گئی تو اس شہرۂ آفاق نوسرباز نے بڑا نام پیدا کیا۔ سرکاری سپلائی کے گوداموں سے وافر چینی کا سٹاک نکلتا اور اس کی آڑھت کے چور دروازے کی راہ سے حاجت مندوں کی دست گیری کرتا۔

ایک روز کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سول حکام نے چینی کے اس گودام کی نبض ٹٹولنے کا پروگرام بنایا۔ نوسرباز خان کو بھی اطلاع ہو گئی اور اس نے راتوں رات چینی کے ذخائر کو اس تاریخی کنوئیں میں انڈیل دیا۔ چھاپہ مار قسمت کے ماروں کی طرح آئے اور حیران لوٹ گئے ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اگلی صبح پو پھٹتے ہی جو پہلا شخص غسل کرنے کے لئے آیا اور اس نے ڈول کھینچ کر جونہی پانی اپنے جسم پر بہایا۔ سر کے بال جٹا دھاری ہو گئے اور پلکیں مُند گئیں ـــــ زہے بخت بلند ایک بار پھر اس کنوئیں کے نصیب یکبارگی جاگ اُٹھے۔ خبر ہوا کے پر لگا کر اُڑی ۔ بچے بوڑھے عورتیں اور مرد جمع ہونے لگے پنگھٹ پہ کم سن سہیلیوں کا جمگھٹ ہو گیا شہر کے کونے کونے سے حلوائی پنساری اور سوڈا واٹر کے بیوپاری جوق در جوق آئے اور بالٹیاں بھر بھر کر لے جانے لگے۔

اسی دوران حضرت قبلہ سائیں چپ شاہ صاحب کو بھی خبر ملی۔ وہ خاموشی کے ساتھ کنوئیں کے برابر آکر بیٹھ گئے۔ اُنہیں چپ اس وقت لگی ہے کہ لوگوں میں ان کی مایہ ناز جہالت کا راز فاش نہ ہو جائے۔ آناً فاناً مشہور ہو گیا کہ یہی وہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جن کے وظیفہ جمالی کی بدولت کنوئیں کا پانی میٹھا شربت ہو گیا۔ اب لوگ کنوئیں سے کراماتی شربت نکالنے کے ساتھ ان کے مقدس گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگانے اور ڈنڈوت کہنے لگے ۔۔۔ لوگوں کو بھی شاید اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایسے ہی پیشہ ور دلالوں کی ضرورت ہوتی ہے جو دل کے عمیق ترین گوشوں میں چھپے رازوں کو جانتے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے بے اولادوں کو اولاد مہیا کرانے والے یہ نورانی ٹھیکیدار بڑے ہی ادب کے لائق ہیں۔ یہ فرش سے عرش تک ہر شے کا علم رکھتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے تو صرف اتنا کہ مریدوں کی کمائی میں حلال کتنا اور حرام کس مقدار میں شامل ہے۔ ان کے بدکردار مُرید کھلے بندوں رشوت وصول کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لیکن جب تک ان کو گندم کی بوریاں اور نذر نیاز کا عُشر پہنچتا رہتا ہے۔ انہیں مباح ہے کہ اپنی بھٹی گرم رکھیں۔

ادہر چپ شاہ کا تکیہ لگا اور نیاز مندوں کی ٹکسال کھلی ادہر شربت دیدار کے دیوانوں میں ہاتھا پائی اور تکا فضیحتی ہونے لگی۔ جس پر کوتوال اور درجن بھر سنتری موقعہ واردات پر پہنچ گئے داس

کنوئیں پر یہ ان کا دوسرا پھیرا ہُوا) "خفیف" سا لاٹھی چارج ہُوا اور لوگ "شدید" زخمی ہوئے۔ مگر لوگ ضرب کھاتے پھر بھی آگے بڑھتے جیسے بھینس ڈنڈا کھا کر برابر گھستی چلی آتی ہے۔

اس اثنا ایک مقامی سکول کا سائنس ٹیچر بالٹی بھر شربت لے کر گیا۔ لیبارٹری میں تجزیہ کے بعد اس نے بتایا کہ خالص چینی کا شربت ہے اور خاصہ گاڑھا ہے۔ اس کی چاشنی بخوبی تیار ہو سکتی ہے۔ اگر "جوارش جیلی نوس" کے اجزا سفوف کر کے اس میں ملائے جائیں تو اصلی "معجونِ شباب آور" تیار ہو سکتی ہے۔ اسے تجزئیے میں ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ شربت میں فاسفورس کے اجزا بھی کم و بیش موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی باشندوں کے امام مسجد نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور وعظ کے ضمن میں شین قاف اور عین کے پورے اعلان کے ساتھ فرمایا کہ چند ہفتے پیشتر ایک کتا کسی مریل بلی کے تعاقب میں بھاگا اور کنوئیں کو پھلانگتے ہی دونوں جانور کنوئیں کے اندر جا گرے۔ ضرور ان کی ہڈیوں کا فاسفورس کراماتی شربت میں مل گیا ہو گا۔ واللہ اعلم۔

ٹھنڈی سڑک

"ٹھنڈی سڑک" کو یہ نام شیشم اور سرس کے گھنے گھنیرے درختوں کی خنک چھاؤں کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ شہر کی ہماہمی اور شور و شغب سے دُور سیر و تفریح یا حُسنِ افرنگ کی نازک خرامی کے اعتبار سے اس شاہراہ کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔ رہائشی بنگلوں کو چھوڑ کر بین الاقوامی شہرت کے ڈو ہوٹل اور اس کے متصل پنڈی کلب اور نکڑ پر گرجا گھر کی شاندار عمارت کھڑی ہے۔ یہاں جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کا مجسمہ بھی نصب ہوا اور غلامی کی پشت پر جبر و استبداد کی اس مہر کا نقش ثبت کرتے وقت جشنِ عظیم بپا کیا گیا۔

یکم جنوری سنہ ۱۰ء کو دوپہر سے قبل شروع سال کی روایتی پریڈ

کے بعد اس کی نقاب کشائی ہوئی۔ بت کا سیمیائی سراپا سفید برقعہ کے اندر روگیر تھا۔ گویا پیکرِ ماہتاب، براق ریشمی قبا اوڑھے کھڑا تھا۔ اسٹیشن کمانڈر آگے بڑھا اور برقعہ اُلٹ کر رونمائی کا آغاز کیا۔ فوجی بینڈ کے ہلکے سُروں کے درمیان چاک وچوبند دستے سلامی دیتے گزرنے لگے۔

انگریز اپنے ساتھ اپنے مفاد کو لایا تھا۔ اس کے سر میں حاکمیت کا خناس بھی تھا اور کالے گورے کے نسلی امتیاز کی بو باس بھی۔ قدم جملتے ہی فضا بدل جہاں بدلا۔ سڑکوں کے نام ہارڈنگ، الن برا، اور ڈلہوزی روڈ قرار پائے۔ وکٹوریا اور مارگلا بیرکس تعمیر ہوئیں۔ یہ صرف نام ہی نہ تھے بلکہ کڑی کمان کے سنسناتے تیر تھے جو دماغوں میں پیوست ہونے لگے۔ مارگلا بیرکس مغرب کی سمت واقع تھیں۔ اس نسبت سے لوگ اب وقت کا تعین کرنے لگے کہ سورج مارگلے کی اوٹ میں ہو گیا۔ شام ہونے ہی والی ہے اور شام واقعی ہو بھی گئی۔ انگریز سے پہلے مغرب کی سمت سے کالی گھٹا اُٹھتی تو بڑے بوڑھے پکارتے کپڑا لتہ سنبھال لو مغرب سے بادل اُٹھا ہے برسے بغیر نہیں ٹلے گا۔ لیکن اب اُمڈتی گھٹاؤں کو دیکھ کر کہا جاتا کہ مارگلے سے ابر چلا ہے۔ موسلادھار بارش ہوگی۔ گویا مارگلا سمت نہیں، ابرِ باراں کی علامت بن گیا اور اس علامت کا مرکزی نقطہ آنجہانی ملکہ کا یہ مجسمہ تھا جو ٹھنڈی سڑک کے چوراہے پر کھڑا کیا گیا تا آنکہ قیامِ پاکستان کے بعد اس بت کا فر

اداکو یہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس طرح ایک سرافراز گردش حالات کی ٹھوکروں کے حوالے ہو گئی اور ایک مرمریں پیکر آئینہ حیرت کی پہنائیوں میں تحلیل ہُوا۔ ایک نرالی صبح جب شاہد خاور نے مشرق کے دریچوں سے جھانکا تو اُسے سنگِ مرمر کے ریزے دھواں بن کر مغرب کی سمت اُڑتے نظر آئے۔

کسی ماہر سنگ تراشی کے کمالِ آذری کا یہ شاہکار ۱۹۰۷ء کو انگلستان میں تیار ہُوا۔ کہتے ہیں یہ مجسمہ فنی اعتبار سے اپنے اُن تمام ہم جنس بتوں سے کہیں بڑھ کر تھا جو لاہور اور کلکتہ وغیرہ شہروں میں انگریزوں نے نصب کئے تھے۔

تقریباً نصف صدی تک ٹھنڈی سڑک سے گزرنے والے راہی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر دیکھنے کے لئے مجبور ہوتے اور اسے دیکھتے ہی احساس ہوتا کہ ؎

حُسنِ سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر

نفسیاتی طور پر اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ مجسمہ ملکہ وکٹوریا کے عہدِ شباب کا عکسِ جامد تھا۔ انگریز لوگ عام اس سے کہ سوار ہوں یا پیادہ یہاں سے گزرتے ہوئے احتراماً اپنی ٹوپی اُتار لیتے اور ان کی خاموش نگاہیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتیں۔ کیونکہ دولت انگلیسیہ کو وکٹوریہ کے جبروت و اقبال مندی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔

پنڈی شہر کبھی مُغلیہ سلطنت کا حصّہ تھا۔ اکبر اعظم نے اپنے عہد

میں سوہاں کے کنارے کئی روزہ کیمپ لگا کر مقامی گگھڑ سرداروں سے ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔ شاہجہاں کے عہد میں پنڈی شہر پر خاصی توجہ مرکوز کی گئی۔ اورنگ زیب کے کمزور جانشینوں کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر پہلے جھنڈے خان گگھڑ نے پوٹھوہار پر قبضہ کیا۔ پھر ۱۷۶۵ء کو ایک سکھ لٹیرے سردار ملکھا سنگھ نے قبضہ جمایا اور اس کی اولاد پون صدی یہاں حکمرانی کے مزے لوٹتے رہے حتیٰ کہ ۱۸۴۹ء کو سکھوں نے شکست کھائی اور انگریزوں نے پورے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

انگریز کی بالادستی قائم ہو گئی تو اُن لوگوں نے جو مالی اعتبار سے نادار تھے۔ راضی برضا ہو کر خودی کو بیچا اور قیصری میں نام پیدا کرنے کے لیئے ٹامی کی غلامی کو اپنے لیئے سرمایۂ فخر سمجھا۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ملکہ وکٹوریہ کا یہ مجسمہ اور اس کے ہمزاد سائے کابوس کی صورت سارے ماحول پر مسلط تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب حالات نے کروٹ لی تو انقلاب کی رو چلنے لگی اور شعور آزادی کا اجالا پھیلنے لگا ہٹلر کی جنگِ عظیم کے دوران خاموش جذباتِ نفرت کا لاوا جو مدت سے دلوں میں کھول رہا تھا ایکا ایکی اُبل پڑا۔ ایک رات کسی دل جلے نے اس مجسمے کی صراحی دار گردن میں پرانے جوتوں کا ہار پہنا دیا۔ اس پہ ہی بس نہیں، بلکہ کسی گستاخ نے پیکرِ مرمریں کی سیدھی کلائی توڑ کر رکھ دی۔

مسلسل قیامِ بے رکوع کے اس زاویہ قائمہ کے روبرو ایک کُنجِ خاموش میں گرجا گھر کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ اُن تاجروں کی یادگار ہے جو تاریخ کے عہدِ عتیق میں سوداگر بن کر آئے۔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ سیاسی قوت بن کر اُمڈے اور ۱۹۴۷ء میں مسافر بن کر نکل گئے لیکن اس عالم میں نکلے کہ برصغیر کی سرزمین آگ اور خون کا لاوا اُگل رہی تھی اور کتا گھوڑے کے ڈھیر پر کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا، آہمسو پرمودھرما کے پجاری مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ فضا دردناک چیخوں سے معمور تھی۔ ان حالات میں مادرِ گیتی نے دردِ زہ کی زہرہ گداز ٹیسوں کے درمیان دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مملکت کو جنم دیا۔

گرجا گھر کے متصل سڑک کے اس پار آرمی سپورٹس سٹیڈیم واقع ہے جس کے گرداگرد چاردیواری کھینچی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں سگنل یونٹ کے خیمے گڑے تھے۔ جہاں ہر روز دن کے ٹھیک بارہ بجے ایک توپ داغی جاتی جس کی آواز دُور دُور تک گونجا کرتی۔ لوگ اپنی گھڑیوں کا وقت بھی ملا لیتے اور سکھ دوستوں سے خوش طبعی بھی ہو جاتی۔ چندے بعد سگنل یونٹ اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہو گئی اور یہ میدان کھیل کے لئے وقف کر دیا گیا۔ توپ داغنے کا رواج بھی متروک اور اس کی جگہ ۱۹۲۵ء میں بجلی گھر سے ہوٹر بجنے لگا۔

سٹیڈیم کی چاردیواری اور سڑک کے درمیانی برزخ میں ایک

مستطیل باغیچہ ہے اس کے ایک گوشے میں آبدار اور بیرے خانساماں لوگ منڈلی جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے آباو اجداد بھی یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی خدمات حاصل کرنے والے انگریز افسر یہیں ان کی تلاش میں آیا کرتے آج بھی قریب قریب وہی روایت باقی ہے یہ بیرے خانساماں حضرات بھلے وقتوں کو یاد کرتے ہیں۔ جب تنخواہ اگرچہ کم ہی سہی مگر "اوپر سے بہت فتوحات رہا کرتیں۔ پچھے الگ چرائے جاتے اور حسنِ کارکردگی کے انعام میں پرانے کوٹ اور جوتے بھی ملا کرتے۔ مگر اب جامِ جم خوابِ شب پارینہ ہو کر رہ گیا۔ بعض انگریز اپنے وفا شعار خدمتگاروں کی دس بیس روپے پنشن بھی لگا جاتے تھے۔ مجھے ایسے ہی ایک بوڑھے آبدار کا حال معلوم ہوا جس کو حسنِ خدمت کا یہ صلہ امپیریل بنک کی وساطت سے مدت العمر ملتا رہا۔ کارِ قضا وہ سال خوردہ بزرگ ایک روز بیمار ہو گیا تو بسترِ مرگ پر اپنے ولی نعمت مسٹر براؤن کو یاد کرتا اور دہائیاں دیتا کہ آج "میرا صاحب" یہاں ہوتا تو ملٹری ہسپتال میں علاج معالجہ کراتا کبھی چھاتی پر ہاتھ مار کر ہائے براؤن واے براؤن پکارتا۔ کبھی درد بھری لے میں یہ شعر گنگناتا ؂

مناسب ہو تو اے ظالم گھڑی بھر کے لئے آجا
بجھانی ہے ترے دامن پہ شمعِ زندگی اپنی

غرض کہ نزع کی حالت میں اپنے آقا کا نام لیتے لیتے دارِ فانی

سے کوچ کر گیا۔

کرسمس کے دنوں میں ٹامیوں کو کھلی چھٹی مل جاتی اور وہ ٹھنڈی سڑک پہ جلوس در جلوس آ کر کھل کھیلتے۔ ان کے بھاری بھر کم بوٹوں کی ٹھوکروں میں کالے لوگ پامال ہوتے۔ خوانچے والے لٹ جاتے اور تانگے والوں کو سواری کے دام نہ ملتے۔ کم و بیش دس روز تک یہ خرمستیاں رہتیں اور خوف و ہراس کی عملداری قائم ہو جاتی۔ نشہ کی حالت میں ان گوروں نے ایک مرتبہ گراس فارم کو آگ بھی لگا دی۔ اپنی ہے ہنگامی میں کبھی کبھی میسی گیٹ کے اندر ہجوم کرتے اور دکانیں لوٹ لیتے۔ کوٹلہ سنٹر کی ایک بغلی گلی میں چکلہ قائم تھا جو ۱۹۱۵ء کے قریب ٹامیوں کی ہڑبونگ کے باعث بند ہوا۔

رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ٹامیوں کی سینہ زوری کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ شہری غنڈوں کی ٹولیاں ان کے شکار کو نکلتیں اور کوچوان اپنے تانگے کی نشست کے نیچے دو ایک جوان بٹھا رکھتے تاکہ اُجرت وصول کرنے میں سہولت ہو۔ دکانداروں نے لوہے کے گرز مہیا کر لئے۔ ایک روز لال کرتی بازار کی کسی دکان پر ٹامیوں نے حملہ کیا۔ دو دکانداروں نے اپنا گرز سنبھال کر شمشیر زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ ایک عدد ٹامی کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ بقیہ ٹامی گرمیوں کے بادل کی طرح چھٹ گئے۔ مُردہ گورے کی لاش گھنٹہ بھر تک وہاں پڑی رہی۔ آخر وہ دکاندار خود ہی تانگے میں اس کو

لاد کر لے گیا اور یونٹ میں پہنچا آیا۔ آفیسر کمانڈنگ نے خزانۂ عامرہ سے سّو روپیہ انعام دلوایا۔ کیونکہ اس خیر خواہ نے ٹامی کی لاش کو کتّوں کے لب و دنداں سے بچایا۔

کرسمس آج بھی آتی اور خاموشی سے گزر جاتی ہے۔ ٹھنڈی سڑک کا سہاگ بھی بدستور قائم ہے۔ مگر وائے وہ انگریز جو خود تو چلے گئے مگر انگریزی اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

ایک گلی

تیس برس ہوئے جب اس محلے کے بڑے بوڑھے ابھی زندہ تھے۔ مسجد کی چاردیواری اُن سے آباد اور اس آبادی کی ساری رونق ان کے دم سے تھی۔ بہو بیٹیوں کا پردے سے جھانکنا تو درکنار ان کے ڈر سے کوئی پکار کر بات بھی تو نہ کرتی تھی۔ پرانی قدریں کچھ ایسی ہی تھیں اور وہ لوگ بھی عجیب کاٹھ کے قدامت پسند تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن سکول ماسٹر کی بیٹی ایک پیرزادے کے ساتھ نکل بھاگی تو ان میں سے ہر ایک بزرگ نے گہرے کرب کے ساتھ محسوس کیا تھا شاید اس کی اپنی ہی بیٹی پر لگا کر تاریک بادلوں میں روپوش ہو گئی۔ پھر یہ لوگ اس دن کسی قدر کھوئے کھوئے رہے اور دبی دبی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ ایک نے کہا زمانے کے چلن ٹھیک نہیں۔ بیٹی کی عصمت کو

باپ کے اطوار کھا گئے کہ اس کے اپنے لچھن اچھے نہ تھے۔ جوانی میں تماش بین تھا اور فارغ البالی کے کارن زمین پر اس کے پاؤں ٹکتے ہی نہ تھے۔ غلط اندیش کو غلط کار حواری مل جاتے ہیں۔ انہی کے ساتھ شام کو پٹھانی کے ہوٹل پر محفل جما کرتی، قہقہے اور پھبتیاں، فحش گوئی اور دشنام طرازیاں یہاں کا روزمرہ تھیں ۔۔!

پٹھانی جس کا یہ ہوٹل تھا ایک جوان جہان بیوہ تھی۔ بڑی دبنگ قسم کی عورت کھلتا ہوا رنگ اور خاصہ چہرہ مہرہ پایا تھا۔ گاہک اس پر اور چھوٹی رس پر گرتی ہے۔ تب ہی تو یہاں اژدحام رہتا تھا ۔

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

سکول ماسٹر اس سبھا کا راجہ اندر تھا لیکن لال پری کسی پر بند نہ تھی۔ پھر اندر کیوں پابند ہوتا جیب میں زر و مال بھی تھا اور جوانی کا جام آپ سے آپ چھلکے جاتا تھا۔ کوئی یار باش خبر لاتا کہ کلکتہ میں ایک نئی طوائف شیلانگ سے آئی ہے کم سن اور چنچل، نرگسی آنکھوں سے مدھر رس ٹپکاتی۔ ہنگامِ رقص قیامت ڈھاتی اور باتوں میں امرت برساتی ہوئی ۔!

شوق کی آگ اس خبر سے بھڑک اٹھتی ۔ شعلے خرمنِ ہوس پہ لپکتے اور رات کی پہلی گاڑی سے یہ منڈلی منزلِ مقصود کا راستہ لیتی لیکن پیاسے کو دجلہ کب سیراب کر پایا ہے۔ بنگال کا جادو اعصاب

سے اترنے بھی نہ پاتا اور تازہ اطلاع ملتی کہ پشاور میں کسی مقنّع نے نخشب کے کنوئیں سے چودھویں کا چاند برآمد کیا ہے۔ بھیڑیئے کی بھوکی نگاہیں شکار کی تلاش میں اُدھر چل نکلتیں۔ کلکتے سے پشاور تک شاید یہی ایک شاہراہ اعظم چلی جاتی ہے جسے شیر شاہ سوری نے تعمیر کیا تھا۔

یہ لیل و نہار تھے جب ماسٹر کے چراغ میں روغن کم ہوتے ہوتے ایک دن بالکل ناپید ہو گیا۔ آسودگی نے آنکھیں پھیر لیں تو دم بھرنے والے حواری بھی لد گئے۔ اب پاپی پیٹ کو بھرنے کے لئے اجارۂ عیاش نے ایک سکول میں مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اسی نازک مرحلہ پہ وہ ماسٹر سکول میں پہنچا یعنی شعر را بمدرسہ کہ برد۔

اس داستان کے ٹکڑے کئی دن تک محلے کی فضا میں بکھرتے رہے اور آخر کار دوسری داستانوں کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ گئے جیسے فلک سے کوئی تارا ٹوٹ کر تاریک پہنائیوں میں ہمیشہ کے لئے تحلیل ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی مشترکہ چندے سے مولود شریف کی محفلیں برپا ہوتیں۔ خوش الحان واعظ بلوائے جاتے۔ درود و سلام کے نور سے بام و در جگمگا اُٹھتے۔ وعظ کی تاثیر کانوں سے اُتر کر دل میں تیر جاتی۔ مولائے یثرب کی سیرت میں یہ بات تو ہے کہ آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور بیان میں درد ہو تو کوئی آہٹ شہ رگ کے قریب تر محسوس ہونے

لگتی ہے۔

کسی دن قوالوں کی کوئی ٹولی آٹپکتی رت جگے کی یہ اتفاقی رت بھی یادگار سے کم نہ ہوتی۔ فضا کے سناٹے میں گلوں کا ترنم اور ساز کا زیر وبم دُور دُور تک گونج اُٹھتا۔ دل والوں پر حال طاری ہو جاتا کہتے ہیں قوالی سے رُوح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے بانکے اور سجیلے جوانوں کی نگاہیں منڈیروں پر لہراتے ہوئے سفید و سیاہ سرُخ اور دھانی دوپٹوں سے جھانکتی ہوئی زلفوں میں جا اُلجھتیں اور خموشی ہی خموشی میں بسا اوقات کہانیاں بن جاتیں۔

ایک اور شیخ صاحب سے کسی نے کشائش رزق کا یہ مجرب نسخہ بیان کر دیا تھا کہ مجلسِ ذکر و نیاز منعقد کرانے سے خدا چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اُن کی بیٹھک میں ہر پندرھواڑے یہ ہنگامہ بھی چل نکلتا۔ رنگا رنگ کے صوفی صافی اِدھر اُدھر سے آن بیٹھتے اور ذکر کی ضربوں سے دلوں کے ساتھ چھت کی کڑیاں بھی ہل جاتیں۔ طاقچے میں شمع جھلملاتی، اگر بتیوں کی خوشبو کھڑکیوں سے چھَن چھَن کر محلّے کو مہکاتی اور اہلِ دل آنکھیں میچ کر نیلی چھت والے سے لو لگا کر بھیپھڑوں کی ورزش میں مصروف ہو جاتے اور گئی رات تک اہلِ محلّہ کو مفت کی شب بیداری کرنا پڑتی۔ ایک غیر مقلد کو یہ ہاؤ ہو بہت ناگوار گزرتی اور وہ چرچا کرتا پھرتا۔ "یارو خوفِ خُدا کرو۔ اللہ جب سورہ فاتحہ کے آخر دھیمی آواز میں "آمین" سُن لیتا ہے تو تمہارا ذکر خفی

کیوں نہیں سن سکتا" یہیں سے مناظرہ بازی کی ابتدا ہوتی اور علمائے کرام کی فصل پک کر تیار ہو جاتی۔ مناقشت کی رو چل نکلتی اور چھریاں چلتے چلتے رہ جاتیں۔

لیکن اس ہنگامی سی تلخی کے باوصف اہلِ محلہ مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو جاتے۔ باہر نکڑ پہ کلّو نامی ایک دکاندار تھا۔ پیدائشی مسخرا اور باغ و بہار قسم کا انسان۔ اس کے یہاں اپنے پرائے سب جمع ہوتے تھے۔ بعد عشا گپ شپ کا بازار گرم ہوتا تو بات کے ساتھ رات بھی اپنی ہو جاتی۔ دروغ بافیوں کے فانوس جھلملاتے۔ ہنسی مذاق اور دل لگی کا سامان بھی رہتا۔ کبھی کسی مفلوک حال پردیسی کو روزگار دلانے کے بہانے بھنگ کے پکوڑے کھلائے جاتے اور اس کی بہکی بہکی باتوں سے کیف و سرور حاصل کیا جاتا۔ جب تھک ہار کر اس کی آنکھیں خود بخود مُند جاتیں تو شکستہ چارپائی کے ساتھ تختہ کر کے نالی کے وسط میں چھوڑ آتے۔ یہاں دن کے اجالے میں اس کی آنکھ کھلتی تو دوسرا ہی عالم نظر آتا کہ عجیب طلسم خیال ہے جو رات خشکی میں سوئے ہوئے تھے لیکن صبح پانی پر لرزاں پائے گئے ؎

سپنے اندر راجہ بھیو جاگت بھیو کنگال

شاید بیروزگاری سے ملازمت کے ساحل تک اسی سفینے میں جاتے اور بےچارگی انہی ٹھوکروں میں دوسروں کے لئے مسرت

کو جنم دیتی ہے۔ اگرچہ نشاطِ روح کے لئے کسی خارجی سامانِ تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سے آپ بھی اپنی حماقتوں پر قہقہے لگائے جا سکتے ہیں لیکن چونکہ زندگی داخلی اعتبار سے بجائے خود عبرت ناک المیہ ہے۔ اس لئے راہِ فرار ڈھونڈنے کے لئے بزمِ طرب جمانے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔

بہادر خاں صفائی کا داروغہ تھا۔ جہاں دیدہ۔ عمر رسیدہ اور جاہل گپ طراز ۔ اسے کیمیا سازی کی علت بھی تھی۔ تانبے کو سفید کھیل کر کے خوش ہوتا اور دوسروں کو اپنے کارنامے دکھاتا پھرتا۔ پارہ اگرچہ اس سے سارا مرا نہیں اور گندھک بھی صحیح رنگ سے تیل نہ ہوئی۔ مگر اس کی ہمت پر آفریں کہیئے جس پر ہمت العمر اہم نخ نہیں آئی۔ سنیاسیوں اور مہوسوں کے پیچھے پیچھے مارا مارا پھرتا اور کوئی تجربے کی بات معلوم کر کے اپنے حیلے میں لگ جاتا لیکن زہرہ کی سفیدی شمس کی زردی میں تبدیل نہ ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے چہرے کا رنگ روز بروز ماند پڑتا گیا۔ آنکھیں سم الفار کا دھواں کھا کر نیلگوں نظر آنے لگیں اور یار لوگوں کو مذاق کا طرفہ پہلو ہاتھ آ گیا۔ ان کی پھبتیوں کی آگ میں بہادر خان کے صبر و قرار کا تانبہ تپ کر لال ہو جاتا اور اس کی مہندی موچھوں کے بال بھڑکنے لگتے۔ دُخان آلود آنکھوں کی نیلاہٹ میں شنجرفی لہریں تڑپنے لگتیں۔

محلے کے اس رُخ پر جو سڑک کی سمت واقع ہے چند ایک ہم شکل

جوڑوں کو اُٹھا کھڑے ہیں۔ اس زمانے میں یہاں غیر مسلم بنئیے اور دکان دار رہتے تھے جو دوسرے اہلِ محلہ سے بوجہ تعصب کم آمیز رہتے۔ لیکن اُن کے سوکھے ساکھے مریل سے بچے محلے کے دوسرے مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جاتے۔ اکثر و بیشتر پٹتے اور چیختے چلاتے اپنے گھروں کو بھاگ جاتے اور ان کی مائیں کائیں کائیں کرتی ابھر آتیں غصے کی شدت میں اُن کے جملے چرچر اور کرکر کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہ آتے۔ مگر حبیب کھڑکی کے کواڑ نصف سے پٹک کر اندر کو سرک جاتیں تو مسلمانوں کے حق میں مِن حیث القوم ایک غلیظ گالی صاف سنائی دیتی لیکن بات کبھی بھی بڑھنے نہ پاتی تھی۔ بچوں کے جھگڑوں میں عقلمند والدین ہمیشہ غیر جانبدار رہتے ہیں۔

ان مکانوں سے ہٹ کر کچے گھروندوں کا جھرمٹ تھا۔ جن کے کچھ کھنڈر آج بھی باقی ہیں اور بعض حصے نئے بھی تعمیر بھی ہو چکے۔ ان میں معمولی پیشہ ور طبقہ آباد تھا۔ ایک کشادہ حویلی پر نذرو مطرب زادہ کا قبضہ تھا۔ اُس نے حویلی کی بعض کوٹھڑیاں کرایہ پر اُٹھا رکھی تھیں۔ اس کے بچوں کی ماں بڑی دلچسپ اور گھمبیر عورت تھی۔ جس کی برکت سے حویلی کے دوسرے مکینوں میں اکثر جوت پیزار رہا کرتی۔

نذرو کسی ہوٹل میں ملازم تھا۔ اُسے خدا نے چار بیٹیوں کے بعد بیٹا عطا فرمایا۔ بیٹا کیا پیدا ہوا۔ عرش سے رحمت کی بوند برس گئی۔ مہینہ بھر تک ڈھولک بجتی رہی اور مارے پنجابی گیتوں کے

اہلِ محلہ کا ناک میں دم آگیا۔ اک دل جلے نے تنگ آکر کہا۔ خدا خیر کرے۔ عاقبت بھلی اور شیطان کے کان بہرے ہوں۔ نذرو کو یہ خوشی نصیب ہوتی نظر نہیں آتی۔ اتفاق ہی سمجھئے کہ سبز قدم بچہ ابھی چلے ہی میں تھا کہ نذرو خدا کو پیارا ہوگیا۔

بہت عرصہ نہیں گزرا ایک نیا خاندان یہاں آکر آباد ہوا۔ خاندان کیا تھا۔ محلے میں ایک پورا محلہ گھس آیا۔ چھوٹے چھوٹے ہتق مہتھنے بچوں سے لے کر بڑی بڑی مونچھوں والے ہیبت ناک جوان اور چھوٹی بڑی عمر کی کئی عورتیں تھیں۔ اصل میں یہ کنبہ ایک متوسط حال ملازم پیشہ بزرگ کا تھا جس کے سالے سالیاں وغیرہ بھی ہم رکاب تھے۔ یہ لوگ آتے ہی محلے کی چودہراہٹ پر قبضہ جمانے کی فکر میں لگ گئے۔ ان کا حق یوں بھی مضبوط تھا کہ وہ اپنے تئیں سادات کہتے تھے۔ اگرچہ شکل وصورت کے اعتبار سے ایسی کوئی علامت اُن میں نمایاں نہ تھی لیکن چونکہ اُنہیں اصرار تھا۔ لوگوں نے اُنہیں اسی لقب سے پکارنا شروع کردیا۔ اور اس میں مضائقہ بھی کیا تھا۔ فسادات کا خدشہ نہ ہو تو ہر شخص خود کو سادات میں شمار کرا سکتا ہے۔

بنا بریں سادات کا یہ جہازی کنبہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا پھیلتا اور پھولتا چلا گیا۔ چھوٹے بچے سیانے ہوگئے اور اُنہوں نے ہر طرف دھینگا مشتی کی طرح ڈال دی۔ خوانچے والوں کے ساتھ دست درازیاں شروع ہوگئیں اور حسّو نانبائی کی لڑکی کو اُنہوں نے

آنکھیں مار مار کر جوان کر دیا۔

وقت گزرتا گیا۔ سال خوردہ بزرگ روانہ ہوتے چلے گئے۔ کچھ لوگ مکروہات زمانہ کے باعث نقلِ مکانی کر گئے۔ بعض کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا۔ کچھ لوگ کان سے بہرے اور کتنے ہی عقل سے بھی بے بہرہ ہو گئے کئی عورتیں جوانی میں بیوہ ہو کر بیٹھ گئیں اور محلے کی معاشرت میں رنگا رنگ گُل بوٹے اُگ آئے چودھری مینو کی تین بیٹیاں آسمان کو چھونے لگیں اور یہاں سے وہاں تک حسن و عشق کی سرسوں پھول گئی۔ کہیں سے عصمت آرا نام کی ایک بی بی بھی اس گلشن میں آ ٹپکی اور آتے ہی اس مٹی کے مزاج میں اتر گئی۔ چمپئی رنگ پر بناؤ سنگار کی بہار دیکھنے کی چیز تھی۔ خبر نہیں کہاں سے نازل ہوئی اور کدھر گئی۔ ہاں تین چار ہی برس میں اس نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اس کے معزز اور خوش لباس مہمان نہ جانے کہاں کہاں سے آتے اور گھڑی دو گھڑی ٹھہر کر روانہ ہو جاتے۔ باہر سڑک پر نئے نئے ماڈل کی کاریں اس قرینے سے کھڑی ہوتیں جیسے گلی میں اسمبلی ہال کھلا ہوا ہے۔ اہلِ محلہ کو اس سے بیشتر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ لمبی چوڑی کاروں والے یہ معززین سب کے سب عصمت آرا کے بھائی بند ہیں جو اپنی لاڈلی ہمشیرہ سے ملنے آتے ہیں۔

عصمت آرا کے یہاں آئے دن کسی سالگرہ کے عنوان سے جشن بھی منائے جاتے جن میں محلّے کی نوجوان زادیاں مدعو ہوتیں۔ اس محفل آرائی سے بڑے مفید نتائج نکلے اور چودھری مینو کی لڑکیاں بھی اس کے

ہمراہ سیر و تفریح کو آنے جانے لگیں۔ چودھری مینو بچارہ شادی کے بعد ہی کانوں سے بہرہ ہو گیا تھا۔ بیوی اس کی خاصی ہولناک قسم کی عورت تھی اور ہے۔ اس تابناک شمع کی یہ تینوں کرنیں اب اپنے وقت پر فروزاں ہوئیں گویا اس کے اپنے ترکش کے یہ چمکیلے خدنگ اپنی اپنی باری سے نشانہ پہ لگنے لگے۔ کبھی حسرتوں کی بجھی ہوئی راکھ میں کجلائی ہوئی چنگاریاں سلگ اٹھتی ہیں اور آن کی آن میں شعلے ہر طرف لپکنے لگتے ہیں اور بیگم مینو تو ان خوش بخت بیویوں میں سے ہے جو اپنی اولاد کو نیکی کا رامتہ خود سمجھاتی ہیں۔

ادھر یہ عالم تھا ادھر مسجد میں ان حرکات کے چرچے عام ہونے لگے۔ امام مسجد نے پے در پے خطبوں میں دہرایا۔ لوگو ہوش میں آؤ اور اپنے وسائلِ آمدن کا محاسبہ کرو۔ جب تمہاری حیثیت دال پھلکا پکوا کر کھانے کی نہیں تو یہ مرغ آجکل تمہارے گھروں میں کس تقریب سے بریاں ہوتے ہیں۔ تمہاری نوخیز دخترانِ جمال کو حریر و دیبا اور پوڈر سرخیاں کون لا کر دیتا ہے۔ یہ اجنبی موٹروں میں کہاں گھومنے جاتی ہیں۔ لیکن یہ فریاد بے وقت یہ شور بے ہنگام بیکار بیار ہا۔ جبکہ چودہری مینو کانوں سے نپٹ بہرا ہو گیا تھا اور یہ کہ اس کی بیوی کی ہولناکی اب کوئی دن میں اخبار کی خبر بننے والی تھی۔

اب یہ معاشرت دھیرے دھیرے اپنے رُخ سے بہہ رہی ہے اور مسجد کا مینار حیرت سے اپنے سایہ میں بسنے والی مخلوق کو چپ چاپ

تک رہا ہے۔ وہ مخلوق جس کی نقاب زمانے کی تند ہواؤں نے اُلٹ کر رکھ دیا اور اس کے چہرے پہ بھوکی نگاہیں ہوس پرستی کا غازہ مل رہی ہیں۔ قدامت نے اسی انداز سے جدید نسل کے قدموں پہ دم توڑا ہے۔ پرانے گھروندے ڈھے گئے۔ پختہ عمارتیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ دُو منزلہ۔ سہ منزلہ۔ ہاں معیارِ زیست اسی رفتار سے اُونچا ہوتا ہے اور مادرِ فطرت کی یہی آغوش ہے جس میں انقلاب اور عذاب دونوں پرورش پاتے ہیں +

راول سے اسلام آباد تک

راولپنڈی کی مٹی بہت شہر خیز نکلی کہ دیکھتے دیکھتے اس کی کوکھ سے ایک اور بستی اُبھر آئی —— خود پنڈی کی اپنی داستانِ ولادت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ زمانہ گزرتا ہے۔ جب راجہ بازار کے موڑ سے آگے ڈھنگی کھوئی کے آس پاس چند کھپریلیں تھیں اور کچے گھروندے۔ جن میں راول قبیلے کے چند خاندان آباد تھے۔ یہ آبادی اپنی جسامت اور ضخامت میں اتنی مختصر تھی کہ اسے پنڈی یعنی پنڈ (گاؤں) کی تانیث سمجھا گیا۔ راول قبیلے کے لوگ اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اور آنکھوں کے عطائی معالج کی حیثیت سے نگر نگر گھوم پھر کر بیمار آنکھوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ پنڈی میں کب تک آباد رہے اور کب یہاں سے چلے گئے کوئی نہیں جانتا —— ہاں ملوں نامی ایک اور گاؤں اُن

کی یادگار تھا جو ڈیم کی تعمیر کے ساتھ تہہ آب ہوا ـــ

یہ دُنیا ساری کی ساری ایک مسافر خانہ ہے۔ راہی گھڑی دو گھڑی کو مہمان سرائے میں ٹھہرے۔ خوش کام ہوئے۔ دل شاد کیا اور چل نکلے۔ وقت کے ساتھ ساتھ راولوں کا ڈیرا لد گیا۔ لیکن اپنے پیچھے آنے والوں کے لئے قدموں کے نقوش چھوڑ گیا۔ انہی نقوش کو نشانِ راہِ منزل بنا کر اسی جگہ ایک شہر بس گیا اور وہ بسے بھی بس جائے تو بستی ہے اُجڑ جائے تو ویرانہ۔

دھیرے دھیرے ڈنگی کھوئی سے بازار کلاں کی طرف آبادی کے قدم بڑھے۔ یہیں سے بھابھڑ خانے کی نیو رکھی گئی۔ پیچ پیچ گلیاں نمناک کوچے تنگ و تاریک مکان اور ان مکانوں کی آڑی ترچھی دیواریں کہن سالی کا فسانہ دہرا رہی ہیں۔ شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار گتھے ہوئے مکانوں کا ناک نقشہ ان کے مکینوں کے ازلی خوف و ہراس اور خود اعتمادی کے فقدان کی عبرت آموز تصویر ہے۔ ڈاکو اور سکھ لٹیروں کی یورش سے بچ نکلنے کی اُمید پر یہ لوگ اس نوعیت کی بود و باش اختیار کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ خوف و ہراس کا یہ زمانہ انیسویں صدی کے نصف اول تک موجود تھا۔ کیونکہ اس عہد تک پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی اور اُن کا دستور العمل تھا کہ لوگوں کو بیگار میں پکڑ لیتے۔ دکانیں لوٹتے اور گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیتے۔ لوگ اُن کے ظلم و جور کا مقابلہ کرنے کی خاطر شانے سے شانہ ملا کر زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تھے

بہرکیف کوئی بھی خارجی وجہ ہو۔ بھابھڑ خانے میں لوگوں کے مل جل کر رہنے کی فضا قائم تھی۔

بھابھڑ خانے ہی سے آبادی کا سلسلہ آگے چلا اور راسی املا میٹر سے شہر بنتا اور پھیلتا چلا گیا۔ لیکن کچھ بھی ہو آبادی پھیلنے کے باوجود سمٹی سمٹی سی رہی۔ بس یہی کہ چند قدم اٹھے تو ہنی تالاب تک گئے۔ نیچے کی جانب مڑے تو بوہڑ بازار تک آ گئے۔ نیا محلہ تو ابھی کل کی پیداوار ہے اور رتہ امرال اور مریڑ حسن شکل و شمائل کے اعتبار سے دیہات سے بیش نہیں۔

راجہ بازار کی قدامت اور کہن سالی اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن اس تجارتی مرکز کو بڑی حد تک چھاؤنی کی سرپرستی کا منت گزار سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک مشہور تجارتی مرکز ہے جو پرانے کوٹوں کی گرم بازاری سے شروع ہو کر قراقلی کی شانِ کجکلاہی تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ بازار تقسیم تک کباڑ خانہ نظر آتا تھا۔ پرانے کوٹوں کے علاوہ مسجدوں سے چرائے ہوئے جوتے یہاں فروخت ہوا کرتے۔ پیشہ ور جوتی چوروں کا بس یہی ایک ٹھکانہ تھا۔ ایک وقت تھا جب اس بازار میں ہندو تاجروں کا طوطی بولتا۔ صرف ایک بڑی دکان مولا بخش عنایت اللہ کی تھی جو ہندوؤں کی آنکھ کا کنکر بنی رہی۔ یہ اب بھی موجود ہے اور عہد کہن کی یاد تازہ کرتی ہے باقی مسلمان اس زمانے میں تجارت سے چنداں رغبت نہ رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی تجارت یہ تھی کہ چپلی کباب کے

لینڈ ہوٹل کھول لئے۔ شیر فروشی شروع کر دی تاکہ پانی ملانے کی سہولت رہے
یسے بھی ہندو تاجر کوشش کرتے کہ مسلمانوں کے قدم ٹکنے نہ پائیں۔ اگر کبھی کسی
ایم آرٹیانے اس کوچے کے بیچ قدم رکھ بھی لیا تو اپنے قلیل سرمائے سمیت
ر نو خانہ میں ڈوب گیا۔

پاکستان بنا تو یہ آواز گونجی کہ پنڈی کو مملکت خداداد کا دارالخلافہ بنایا
ئے گا۔ اگرچہ وقتی طور پر یہ انتخاب کراچی کے حصہ میں آیا۔ تاہم ۵۸ء کے
د پنڈی کو آخر کار یہ سعادت مل گئی۔

حکومت کے دفاتر کی نقل و حرکت شروع ہوئی تو آنے والے قافلے
رضی طور پر پنڈی ہی میں آکر اترے لیکن اُن کی منزل ایک نیا شہر قرار پایا
پنڈی کے متصل "اسلام آباد" کے نام سے تعمیر ہونے لگا۔

اس شہر کا نقشہ دماغوں سے کاغذ پر اُترا اور دیکھتے دیکھتے تعمیر کا کام شروع
ئیا۔ نور پور اور سید پور کی پہاڑیوں کے دامن میں پُر فضا ماحول اور نظر فریب مناظر کی
وش میں نئے مکانات۔ دفاتر، سڑکوں، ہسپتالوں، درسگاہوں، دکانوں اور سیر گاہوں
تعمیر کا سلسلہ قائم ہوا۔ اس طرح ستاروں کی آنکھوں نے زمین کے سینے پر ایک نئی کائنات
اُبھرتے دیکھا۔ کھیتوں ویرانوں جنگلوں اور بنجر زمینوں پر بشر کی ہمت نے نئی جوت جگائی
اب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا شہر بن گیا ہے۔ حدِ نظر تک مکانوں
سرکاری عمارتوں کے سلسلے پھیلے پڑے ہیں جنگل میں منگل کا سماں ہے۔

اسلام آباد امنگ و امن کی تعمیرِ جدید کا نمونہ ہی نہیں بلکہ قومی ترقی کی شاہراہ
یک مردانہ قدم ہے استقلال کی راہوں کا مینارِ نور ہے خدایا! "اسلام آباد" میں آکر
ے والوں اور اُن کی آئندہ نسلوں کو دامنِ اسلام میں آباد کر دے۔

حرفِ آخر

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

"راول دیس" کی یہ کہانی اس طرح مرتب ہوئی کہ ۵۳ء کے اواخر میں حلقہ ارباب ذوق کی مقامی شاخ کے سکرٹری آغا سے خاکی قزلباش نے ایک روز مجھ سے کہا — "تم حلقہ کے اجلاس میں خاموش آتے اور چلے جاتے ہو تنقید میں حصّہ لیتے ہو اور نہ حلقے میں تم نے کبھی کوئی مضمون پیش کیا ہے" میں نے وعدہ کر لیا آئندہ ماہ تعمیلِ ارشاد کروں گا۔

اصل میں وہ میری ذہنی اُلجھنوں کے شباب کا زمانہ تھا مجھے غیر ارادی چپ سی لگ گئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں جو گرہیں لگائی تھیں اُنہیں دانتوں سے کھول رہا تھا۔ تاریکی اتنی گھمبیر ہو چلی تھی کہ مجھے تقریباً مایوسی ہونے لگی۔ اب کبھی اُجالا نہیں ہو گا۔

یہ لیل و نہار تھے۔ ایک شام ابوالاثر حفیظ اور میجر ضمیر جعفری آئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ ہم پاؤں پاؤں چلتے ایک صاحب کے در دولت پر پہنچ گئے جہاں چند اور اصحاب شوکت تشریف رکھتے تھے۔ بات موسم سے چلی۔ سیاست کی زلفِ دراز میں اُلجھی اور شعر و ادب تک آ پہنچی میں حسبِ معمول بدہوین کر خاموشی کے ساتھ اُن حضرات کے بیٹھے تبصرے

مُنتشار ہا۔ آداب محفل کا بھی تقاضہ ہے کہ جب "ارباب فکر و نظر" اپنی "لایعنی" منطق بگھار رہے ہوں تو نیاز مند چپ رہیں۔ مگر میری خاموشی بھی ایک صاحب کو ناگوار گزری وہ بڑی اُستادی کے ساتھ بات کو گھما کر ایسے رُخ پر لے آئے کہ مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر بھی رُوئے سُخن میری طرف تھا فرمانے لگے "ہمیں معلوم ہے کون کتنے پانی میں ہے اور ہم اُن کیڑے مکوڑوں اور کدو کریلوں کو بھی جانتے ہیں جو دوسروں سے مضمون لکھوا کر اپنے نام سے پڑھتے پھرتے ہیں"

بات یہ تھی کہ اُن صاحب نے "پی۔ای۔این" سوسائٹی کے جلسوں میں میرا ایک آدھ مضمون سُن کر یہ رائے قائم کر لی تھی کہ اس کیڑے مکوڑے کو کوئی اور شخص لکھ کر دیتا ہے ——میں نے اُن کی تیغِ تیز کا گھاؤ اپنے مجروح دل پر لے کر اکبر الہ آبادی کے دو شعر دہرائے۔

مارو کرشن دم رہ گئے کیڑے مکوڑے رہ گئے
صورتیں تو ہیں مگر انسان تھوڑے رہ گئے
شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ اُبھرے ہیں اب
اونٹ رخصت ہو گئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

اور پھر ضمیر جعفری اور ابوالاثر حفیظ کی طرف دیکھا۔ دونوں زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ مگر بتقاضائے بشریت "کرب" کی پریشانی اُبھر اُبھر کر چہرے پر بول رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ مجھے ابھی بہت دنوں خاموش رہنا تھا۔ کیونکہ اس قدر شناس سوسائٹی میں رجس کا اپنے فن کی وساطت

سے میں ایک ادنیٰ خادم ہوں، میرا جو مقام ہے۔ اس کا تلخ تجربہ چند روز پہلے ہو چکا تھا۔

ہوا یہ کہ میں کچھ علیل تھا۔ کرنل ڈاکٹر عبدالعزیز مرحوم مجھ سے میرے حالات کے باوصف محبت کا علاقہ رکھتے تھے۔ اُن سے میں نے فون پر کہا کوئی دوا تجویز کر دو۔ اُنہوں نے فرمایا "آ کر دوا لے جاؤ"

وہاں پہنچا تو ایک مزاح نگار صاحب تشریف رکھتے تھے۔ میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور برآمدہ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس اوٹ سے میں اندر کی بات بخوبی سُن رہا تھا۔ مزاح نگار صاحب نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ کرنل عزیز سے پوچھنے لگے۔ ابھی یہ شخص "جو اُدھر کو مڑ گیا ہے۔ تمہارے پاس کیوں آ جاتا ہے۔ اُنہوں نے کہا ادیب ہے اور میرا دوست ہے۔

مزاح نگار صاحب بولے "تم بھی عجیب ہو کس "پھٹیچر" سے تمہارا یارانہ ہے۔ ذرا اس کی ہیئت کذائی اور لباس تو دیکھو۔ کرنل مرحوم نے کہا۔ "تم مجھ سے بھی زیادہ عجیب ہو کہ خود اہلِ قلم ہو کر دوسرے قلمکار کے متعلق نفرت کا اظہار کرتے ہو۔

مزاح نگار صاحب نے کچھ اور بھی باتیں کہیں مگر میں اپنے بد وضع لباس کے تصور میں ایسا سہک ہوا کہ سوا و ماسوا سے بیگانہ ہو کر رہ گیا اور دل میں یہ صدا گونجنے لگی ؏

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میں ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آیا تھا۔ مجھے کیسا شافی نسخہ عطا ہوا۔ بے رحم زمانے اور اہلِ دُنیا کے ہاتھوں بے بسی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ تاہم

مرا بروزِ قیامت غمے کہ ہست ایں ست
کہ روئے مردمِ دنیا دوبارا باید دید

اصحاب شوکت کی محفل سے نکلے تو ضمیر جعفری میرے شانے ہلا کر بے محابا ہنسے۔ ابوالاثر حفیظ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ اے کیڑے مکوڑے! اگر آج تیرے گھر میں کدو کریلے پکے ہوں تو ہم وہیں چلتے ہیں۔ مگر اتنی بات بتا تا جا کہ یہ عظیم انکشاف جو ابھی ہوا ہے۔ اس کے متعلق تیرا ردِ عمل کیا ہے میں نے عرض کیا کہ پہلے کو ذرا نیم پر چڑھ لینے دو۔ ردِ عمل خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ میری "تذلیل فرمائی" کے باوجود یہ اعتراف کر لیا گیا ہے کہ میری تحریر میں ضرور کوئی صنعت موجود ہے جو یہ حضرات میرے نوشتے پر غیر کا گمان کرتے ہیں ۔۔۔ شاید یہ فقرہ بھی مجھے کسی اور نے لکھ کر دیا ہوگا اور میں نے حفظ کر کے حفیظ کو سنا دیا۔

بات دُور نکل گئی ۔۔۔ میں عرض کر رہا تھا کہ آغا خاکی قزلباش کی فرمائش پر مجھے حلقے کی ایک نشست میں مقالہ پڑھنا پڑا۔ خاصی حاضری تھی۔ یہاں بھی ایک کرم فرما نے خاکی کے کان میں کہا "یہ حضرت دوسروں سے لکھوا کر لاتے ہیں ۔۔۔" خاکی نے جواب دیا۔ اگر یہ بات ہے تو اس پردۂ زنگاری میں چھپے بیٹھے ادیب کا کھوج لگانے کی ضرور کوشش کرنی چاہیئے ۔۔۔ چنانچہ ایک روز انھوں نے مجھے کہا۔

"تم آئندہ کسی نشست کے لئے ایک مضمون لکھو جس کا عنوان ہو گا۔ "پنڈی کا ادبی ماحول" (تقسیم سے پہلے)" یہ عنوان اس لئے تجویز ہوا کہ میرے جن دوستوں پر یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ مجھے لکھ لکھ کر دیتے ہیں اُن میں سے کوئی بھی تقسیم سے پہلے پنڈی میں موجود نہ تھا ــــــ بہرکیف لکھوانے والے نے یہ مضمون بھی لکھوا دیا اور میں نے کسی دعویٰ کے بغیر حلقے میں سُنا ڈالا ــــ پھر "امروز" لاہور میں چھپ بھی گیا اور ادبی محفلوں میں بہت دنوں اس کا چرچا رہا۔

دکھ کی بات یہی مگر ہے کہ زمینِ شور سے سُنبل کی آرزو خیالِ محال ہے۔ میں نے اپنے ارادہ اور لگن سے خامہ و قرطاس کا شغل کسی سے داد و انعام پانے کی تمنا کے بغیر شروع کیا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس قدر دان ملک میں انعام و اکرام سے نوازنے والوں کی کمی نہیں۔ وہ علم و ادب کے خاموش خدام کے لباس کا خورد بینی ملاحظہ فرمانے کے بعد پوچھا تے ہیں کہ "فلاں شخص پھٹیچر" ہے اور اس کو دوسرے لکھ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ لباسوں کے طمطراق اور مال و منال کے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرنے والے بلند مرتبہ حضرات اپنے نجی خط تک لکھنے سے عاجز ہیں۔ میں نے شکستہ حالوں شمع کی طرح گھُل گھُل کر درجن بھر کتابیں تصنیف کر لیں۔ تاہم انتظارِ سحر میں میری جوانی بیت گئی اور اب کر سعی و سائل کے اعتبار سے میری زندگی کے اُفق پر شام کے دُھندلکے پھیل چکے ہیں یہ سطور اس لئے لکھتا ہوں کہ فقیرِ بے نوا کی طرف سے سند رہیں ــ

رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عُمر کے مقام
ہو گئی زندگی کی شام، اب میں سحر کو کیا کروں

"راول دیس" میں جو کچھ درج ہے۔ اس کا آغاز وہی مضمون ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کر چکا ہوں۔ اُنہی دنوں پنڈی ریڈیو سے مجھے مقامی ثقافت کے بارے میں تقریروں کا ایک سلسلہ نشر کرنے کی دعوت ملی۔ ان تقریروں کے دوران ایک ہیولیٰ میرے ذہن میں تیار ہُوا جو رفتہ رفتہ تحریر میں آتا گیا اور اب اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

داستانِ ماضی کا یہ ورق اُلٹتے ہوئے عمرِ رفتہ کو آواز دے کر اپنے تصورات کے دھندلکوں سے اُن نقوش کا سُراغ لگانے کی کوشش کی ہے جو وقت کی تیز گامی کے باعث کہیں نمایاں اور کہیں ادھورے رہ گئے۔ کارواں اس سُرعت سے گزرا ہے کہ اب اس کی گردِ راہ تک کا دُور دُور پتہ نہیں ملتا۔ لیکن خیال کے پردوں پر کچھ تصویریں لرزاں تھیں۔ جن سے میں نے یہ روداد مرتب کی ہے۔ یہ روداد جو میری دید اور شُنید پر مبنی ہے۔ اس شہر کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول کا ہلکا سا خاکہ ہے۔

اس شہر کے قدیم ثقافتی ورثے کی رنگارنگی کے کچھ نقوش ابھی باقی ہیں اور بہت سے مٹ چکے یا مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ موجودہ رنگ ڈھنگ تو آپ کے سامنے کی بات ہے۔ میں نے صرف پنڈی کی قدیم

داستان دہرانے پر اکتفا کیا ہے

استاذ المکرم الحاج مولوی ریاض الدین صاحب سابق ہیڈ ماسٹر ڈینیز ہائی سکول کا سپاس گذار ہوں کہ انہوں نے مسوّدہ کا ایک ایک حرف دیکھا اور مفید مشورے دیئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے ناکارہ شاگرد کی طرح اُن کا حافظہ بھی پختہ اور قابل اعتماد ہے۔ چالیس برس پرانا غبی اور نالائق طالب علم جس کے مستقبل کے بارے میں وہ مایوس تھے۔ اب صاحب تصنیف بن چکا ہے۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں اُن سے بے تحاشہ مار بھی کھائی اور اُن کی غضب ناک نگاہوں سے خوف زدہ بھی رہا۔ وہ بھی سچے تھے میں بھی مجبور تھا۔ کیونکہ ؎

مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند
ہر آں قسمت کہ آنجا شد کم و افزوں نخواہد شد

محترم ممتاز مفتی کا شکریہ۔ انہوں نے کتاب کے بجائے میرا تعارف لکھنا مناسب خیال کیا جو اُن کی محبت کا مظہر ہے اور شکریہ یارِ عزیز الحاج اُستاد یوسف ظفر کا جنہوں نے مسودہ پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اُستادی کا حق ادا کر دیا۔

شکریہ جناب احمد شریف کا جن کی محبت اور مشورے ہر گام شامل حال رہے

عزیز ملک

نمبر ۷۰۹، کوچہ فضل حق
صدر راولپنڈی
یکم دسمبر ۱۹۶۹ء

"زیرِ نظر کتاب میں ہم ایک عظیم شخصیت سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس میں تخیل کی بلندی ۔ مشاہدہ کی گہرائی اور گیرائی بھی موجود ہے مذہبی عقیدت کے ساتھ روحانی بصیرت بھی شامل ہے۔ علم کی وسعت کے ساتھ زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ شعور کی پختگی میں خلوص کی شیرینی رچی ہوئی ہے۔ اپنی عبارت کی نوک پلک سنوارنے کے لیئے وہ اپنے قلم کو خونِ جگر میں ڈبو کر لکھتا ہے۔ یہ عزیز ملک ہے۔ راولپنڈی کا باشندہ جس کی مادری زبان پنجابی ہے۔ لیکن اُردو زبان پر اُسے اتنی ہی قدرت حاصل ہے جتنی اہلِ زبان کو نصیب ہو سکتی ہے۔ یہ قدرت اس کے مطالعہ کی وسعت اور ادیبانہ ریاضت کی پیدا کردہ ہے اس کی نثر کے ہر جملے میں الفاظ کی ترتیب و ترکیب اور ریاضت و پختگیٔ فکر کے وہی تیور موجود ہیں جو کسی بڑے سے بڑے شاعر کی نظم کے مصرعوں میں موجود ہو سکتے ہیں ـــــــ"

ڈاکٹر مسعود رضا
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج شیخوپورہ